بچوں کی کہانیاں

روشنی

شکیل انوار صدیقی

روشنی

(بچوں کی کہانیاں)

شکیل انوار صدیقی

یہ کتاب
اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ
کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

RAUSHNI

(Short Stories for Children)

by

Shakeel Anwar Siddiqui
Lakri Walan, Mughalpura-Ist,
Moradabad-2440011(U.P.)
Ph: 0591-2496549, 9837039935

Year of Edition 2011
ISBN 978-81-8223-850-3
Price Rs. 200/-

نام کتاب	:	روشنی (بچوں کی کہانیاں)
مصنف و ناشر	:	شکیل انوار صدیقی
سن اشاعت	:	۲۰۱۱ء
صفحات	:	۱۲۸
تعداد	:	۴۰۰
قیمت	:	۲۰۰ روپے
کمپوزنگ	:	محمد آصف حسین۔ کمپیوٹر ایرا۔ مرادآباد (یوپی)
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔٦

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

''اُن رشتوں کے نام

جو میری رگوں میں بہتے خون کی طرح

میرے ساتھ ہیں۔''

فہرست

اپنی بات

پرانے ضلع مراد آباد کا قصبہ حسن پور میری جائے پیدائش ہے جہاں ۱۹۴۱ء میں جناب امیر حسن امیر حسن پوری اور محترمہ جمیلہ بیگم کے سب سے بڑے بیٹے کی حیثیت سے پیدا ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں کاروباری مجبوری کے سبب میرے والد مراد آباد منتقل ہوئے۔ اس لئے ابتدائی تعلیم حسن پور اور ثانوی تعلیم مراد آباد میں حاصل کی۔

میں پڑھاکو قسم کے بچوں میں کبھی شمار نہیں کیا گیا، ذرا ذہین تھا اس لئے ایک درجے سے دوسرے درجے میں دھکیلا جاتا رہا۔ درسی کتابوں کی جگہ بچوں کی کہانیوں کی کتابیں اور رسائل پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا لیکن لکھنے کی ابتدا عجیب حالات میں ہوئی۔ اسکول میگزین میں اشاعت کی غرض سے ایک مختصر سی کہانی لکھی لیکن میگزین ایڈیٹر نے ناقابلِ اشاعت کہہ کر واپس کردی۔ ایک دن منڈی بانس کے ایک بک اسٹال پر ایک مقامی ہفت روزہ 'انصاری دُنیا' پر نظر پڑی، ورق گردانی پر معلوم ہوا کہ اس

میں ایک صفحہ بچوں کی تخلیقات کے لئے مخصوص ہے، خیال آیا کہ وہ اسکول میگزین کی 'نا قابلِ اشاعت' کہانی اس اخبار کو دے دی جائے۔ دوسرے دن اس اخبار کے دفتر واقع اصالت پورہ پہنچا، وہاں علامہ کیفؔ مرادآبادی اس اخبار کے نگراں تھے۔ وہ نا قابلِ اشاعت کہانی علامہ کیفؔ صاحب کی معمولی اصلاح کے بعد اس اخبار میں شائع ہو کر میری پہلی کہانی کہلائی۔ اُنھیں دنوں دوسری کہانی اس زمانے کے بچوں کے سب سے قدآور رسالے ''کھلونا'' میں شائع ہوئی۔ یوں میرے لکھنے کی ابتدا ۱۹۵۹ء سے ہوئی۔ اور آج تک لکھنا جاری ہے۔ انشاءاللہ تا حیات جاری رہے گا۔

یوں تو افسانے بھی لکھتا ہوں، تمام اچھے جرائد میں ان افسانوں کی اشاعت بھی ہوئی ہے، برسوں ریڈیو رام پور سے میرے افسانے نشر بھی ہوئے ہیں۔ لیکن میں خود کو صرف بچوں کا ادیب ہی کہلانا پسند کرتا ہوں۔ میں نے خود کو بچوں کے ادب کے لئے وقف کر دیا ہے۔

پیشے سے کمرشیل آرٹسٹ ہوں لہٰذا بطور آرٹست بھی ماہنامہ بچپن، دل بہار، کھلونا، ہلال اور نور جیسے بچوں کے رسائل کو سجانے کا کام بھی کیا ہے۔ بچوں کے لئے اُردو میں تصویری کہانیاں بناتا ہوں اور آج کل بلال، اُمنگ،

گل بوٹے اور گلشنِ اطفال کے لئے تصویری کہانیاں بنا رہا ہوں۔ برسوں ہندی کامکس 'ڈائمنڈ کامکس' سے بطور کارٹونسٹ وابستہ رہا ہوں اور مختلف کرداروں پر سیکڑوں تصویری کہانیاں بنائی ہیں۔

آج کل رحمانی پبلی کیشن مالیگاؤں نے مری کچھ کہانیوں کو یکجا کر کے سُنو بچو! خزانہ، ٹکراؤ اور سچی کہانی عنوانات سے کتابیں شائع کی ہیں تصویری کہانیوں پر مشتمل کتابیں جاسوس ڈالڈا، بڑے میاں چھوٹے میاں اور کرائم رپورٹر شائع کی ہیں۔

۱۹۷۱ء میں بچوں کا ماہنامہ 'چندانگری' کا اجرا کر چکا ہوں جو اب جاری نہیں ہے۔ اب اپنی ایک درجن منتخب کہانیوں کا مجموعہ آپ لوگوں کی نذر کر رہا ہوں اور آپ لوگوں کے تاثرات کا منتظر ہوں۔

شکیل انوار صدیقی

لاکڑی والان، مغل پورہ اوّل
مرادآباد - ۲۴۴۰۰۱

روشنی

ایک بادشاہ تھا۔ اپنے عوام کا بے حد خیال رکھنے والا بادشاہ۔ رحم دل اور انصاف پرور بادشاہ۔

اس کے تین بیٹے تھے۔ جب بادشاہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے تینوں شہزادوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا "میرے بچو! تم دیکھ ہی رہے ہو کہ اب ہم بہت بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں اور حکومت کی ذمّہ داریاں زیادہ دنوں تک سنبھال نہیں سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب تم میں سے کوئی حکومت کی اس ذمّہ داری کو سنبھال لے۔"

تینوں شہزادے سعادت مند بیٹے تھے۔ تینوں نے کہا" آپ جسے مناسب سمجھیں یہ ذمّہ داری سونپ دیں۔"

بادشاہ مسکرایا" دِل کے ٹکڑو! آنکھ کے تارو! تم تینوں ہی ہمارے لیے یکساں ہو۔ ہم تم میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی ناانصافی نہیں کرنا چاہتے۔"

بادشاہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ شہزادوں نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے بادشاہ باپ کو دیکھا۔

بادشاہ نے کہا" ہم نے ایک بہت بڑا گودام تعمیر کرایا ہے اور ہم اس میں عوام کے لیے سب سے ضروری چیز کا ذخیرہ کرنا چاہتے ہیں۔ تم تینوں میں سے جو بھی اس گودام کو اس ضروری چیز سے بھر دے گا، ہم اسی کو اپنا تخت وتاج سونپ دیں گے۔"

"وہ کیا چیز ہے ابّا جان؟" تینوں شہزادے ایک ساتھ بولے۔

بادشاہ ہنس پڑا۔" یہی تو تمہاری آزمائش ہے۔ خزانے سے جس قدر دولت چاہتے ہو لے لو اور آج ہی اس چیز کی تلاش میں نکل جاؤ۔ ہمیں اپنے تینوں بیٹوں پر بھروسہ ہے کہ ہماری خواہش ضرور پوری ہوگی۔"

تینوں شہزادے الگ الگ سمتوں میں سفر پر روانہ ہو گئے اور تقریباً ایک ماہ بعد تینوں شہزادے ایک ساتھ واپس آ گئے۔

بادشاہ نے ان کے آنے کی خوشی میں ایک شاندار جشن منایا اور اسی جشن کے دوران عوام کے سامنے بادشاہ نے اپنے تینوں بیٹوں سے پوچھا:

''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بیٹے سب کو بتائیں کہ وہ عوام کے لیے سب سے ضروری چیز کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں؟''

''جی ہاں' ہم اس چیز کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'' بیٹوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

''پہلے ہمارا بڑا شہزادہ بتائے کہ وہ کیا چیز ہے؟'' بادشاہ نے بڑے بیٹے سے سوال کیا۔ بڑے شہزادے نے اپنی جیب سے مٹھی بھر اناج نکالا۔

''ابا جان! میں اناج سے اس گودام کو بھر دوں گا۔ عوام کے لیے روٹی سے زیادہ ضروری چیز کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے دور دراز کا سفر کیا۔ ہر جگہ یہی دیکھا کہ روٹی سے زیادہ ضروری چیز اور کوئی نہیں ہے۔''

''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا دوسرا شہزادہ بھی بتائے کہ وہ ضروری چیز کیا ہے؟'' بادشاہ نے کہا۔

''ابا جان! میں اس گودام کو دولت سے بھر دوں گا۔'' دوسرا بیٹا بولا۔ ''دولت کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے اس لیے دولت سے زیادہ ضروری چیز کوئی بھی نہیں ہے۔''

اب بادشاہ نے اپنے چھوٹے بیٹے سے جواب طلب کیا۔ ”بیٹے! تم بھی تو بتاؤ۔“

”میں!............“ چھوٹا بیٹا آہستہ سے بولا۔ ”میں، ابا جان آپ کے عوام کے لیے بنائے گئے اس گودام کو روشنی سے بھر دوں گا۔“

”روشنی سے؟ صرف روشنی سے؟“ بادشاہ نے حیرت سے کہا۔

”جی ہاں' ابا جان! روشنی سے! علم کی روشنی سے!“ چھوٹے بیٹے نے بولنا شروع کیا۔ ”آدمی علم کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ نہ دولت اکٹھی کر سکتا ہے اور نہ ہی اناج پیدا کر سکتا ہے۔“

”شاباش بیٹے!“ بادشاہ نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ ”سچ کہا ہے تم نے۔ آدمی کے لیے علم سے بڑھ کر ضروری چیز کوئی بھی نہیں ہے۔“

پھر بادشاہ نے عوام کے سامنے اعلان کیا:

”ہم اپنے بعد اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو تمہارا بادشاہ مقرّر کرتے ہیں۔ وہ تمھیں علم کی روشنی سے مالا مال کر دے گا۔ ایسی روشنی جسے پا کر تم دولت پا سکتے ہو' اناج بھی پیدا کر سکتے ہو۔“

”علم کی روشنی دینے والا بادشاہ' زندہ باد! ہمارا نیا بادشاہ زندہ باد!!“

عوام نے خوش ہو کر نعرے لگائے۔

●●

(نور-رامپور)

(یہ کہانی مہاراشٹر سرکار کے ہائی اسکول کے کورس میں شامل ہے)

خزانہ

بات مذاق کی تھی اور شجّی کو امید ہی نہیں تھی کہ مذاق ہی مذاق میں بات اتنی بڑھ جائے گی ورنہ وہ ایسا مذاق کبھی نہ کرتا۔

اس روز شام کو وہ سب کے ساتھ املی والے کھنڈر میں چور چھپے کا کھیل ،کھیل رہا تھا۔ ایک بار جب اظہر چور بننے لگا تو اس نے بات چھیڑی تھی۔

''تم نے کبھی کوئی ایسی کتاب پڑھی ہے جس میں کسی ڈاکو نے اپنے خزانے کا ذکر کیا ہو۔؟''

''میں نے سلطانہ ڈاکو کی سرنگ کے بارے میں تو پڑھا ہے خزانے کے بارے میں نہیں۔'' شجّی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھتے ہوئے جواب دیا۔

''ویسے یہ ڈاکو ہوتے خوب تھے'' اظہر نے اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کو ذرا ڈھیلا کرنے کی کوشش کی اور بولا:-

''اب دیکھو نا، ہر ڈاکو اپنا خزانہ کسی نہ کسی غار میں چھپا کر رکھتا تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لیے خفیہ نقشہ بناتا تھا۔''

''اور جس کے پاس وہ نقشہ ہوتا تھا وہی اس خزانے کا مالک ہوتا تھا'' شجّی نے اس کی بات کاٹی اور جلدی سے بولا:-

''یہ اپنے چچا اقبال ہیں نا، ان کے پاس بھی ایک خزانے کا نقشہ ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''اچھا؟'' اظہر حیرت سے اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کی جھلکیاں تھیں۔

''ایک دن چچا اقبال بتا رہے تھے کہ ان کے پاس ایک خزانے کا خفیہ نقشہ ہے'' شجّی کو اپنی شرارت پر مزہ آ رہا تھا۔ ''اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ خزانہ بھی کسی ڈاکو کا ہے۔''

"کس ڈاکو کا" اظہر کو کرید ہوئی۔

"ارے ہوگا کوئی سلطانہ ولطانہ۔خزانہ کسی کا بھی ہو خزانہ ہی ہوتا ہے۔"

"اچھا تو چچا نے خزانہ تلاش کیوں نہیں کیا؟"

"بھئی اب یہ تو وہ جانیں۔ہاں ایک دن کہہ رہے تھے کہ انہوں نے کسی لوہے کے بکس بنانے والے کارخانے کو سیکڑوں بڑے بڑے صندوق بنانے کا آرڈر دیا ہے۔"

"سیکڑوں صندوق!" اظہر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اتنے صندوقوں کا کیا کریں گے۔؟"

"خزانہ رکھیں گے بھئی۔" شجی بولا۔وہ کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ اختر، خالد اور سلیم بھی آگئے۔وہ ذرا فاصلے سے کھڑے ہوئے اظہر کی آنکھوں پر پٹی بندھنے کا انتظار کر رہے تھے۔شجی نے بات ادھوری چھوڑ کر پٹی باندھ دی۔اور کھیل شروع ہوگیا۔

شجی سمجھتا تھا کہ چھوٹا موٹا جھوٹ شرارت میں بولا جائے تو کوئی برائی کی بات نہیں، لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ کبھی کبھی چھوٹا موٹا جھوٹ بھی کسی بڑی بات کی بنیاد بن سکتا ہے۔

اس روز اظہر تمام وقت اسی خزانے کے بارے میں سوچتا رہا،

رات کو بھی اسے نیند نہیں آئی اسے رہ رہ کر خزانے اور اُس کے نقشے کا خیال ستاتا رہا۔ وہ سوچتا رہا اگر خزانے کا وہ نقشہ اس کے ہاتھ لگ جائے تو مزہ آجائے مگر چچا اقبال وہ نقشہ اُسے کیوں دینے لگے اس سوال کا حل اس کے ذہن میں نہیں آیا۔

دوسرے دن اسکول جاتے ہوئے اس نے شجی سے اس نقشے کا ذکر چھیڑ دیا، اس وقت سلیم اور اختر بھی ساتھ تھے۔ ان دونوں کو کل اظہر نے خزانے کے نقشے والی بات بتادی تھی ۔ وہ دونوں بھی نقشہ حاصل کرنے میں دل چسپی رکھتے تھے۔

''شجی، چچا اقبال کے صندوق بن کر کب تک آرہے ہیں۔''

''ارے ان کی ایک ہی کہی۔ ہوسکتا ہے وہ صندوقوں کا انتظار کئے بغیر ہی خزانہ نکال لائیں۔'' شجی نے بے پرواہی سے کہا:۔

''اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خزانہ کبھی نہ نکالیں۔ اور صندوقوں میں اپنی کتابیں، کپڑے اور کوڑا کرکٹ بھر دیں۔

''مطلب یہ ہے کہ انہیں اس خزانے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔''

''اب تم ہی دیکھو نا! اگر دل چسپی ہوتی تو اب تک کبھی کا خزانہ نکال لاتے اور پھر ہمارا گھر محل بن گیا ہوتا۔''

''تم بھی نرے بدھو ہو شجی!'' اچانک اظہر کا لہجہ بدل گیا۔

''کیوں اس میں بدھو پن کی کیا بات ہے۔''

''ارے جب انہیں اس خزانے سے کوئی دل چسپی ہی نہیں تو پھر وہ نقشہ تم کیوں نہیں لے لیتے۔'' اظہر نے اسے سمجھایا۔

شجی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''مصیبت تو یہی ہے میں نے ایک بار کوشش کی تھی مگر وہ نقشہ چچا اقبال نے نہ جانے کہاں چھپا رکھا ہے کہ تلاش کے باوجود نہ ملا۔''

''کسی الماری میں چھپا رکھا ہوگا؟'' اس بار اختر نے اسے راہ دکھائی۔

''ایک ایک الماری دیکھ لی تھی اور آج کل تو وہ اپنے کمرے ہی میں رہتے ہیں۔ اس لیے موقع ہی نہیں ملتا۔'' شجی نے بے بسی ظاہر کی۔

''اوہ۔'' اظہر سوچنے لگا پھر بولا ''اچھا اگر تلاش کیا جائے گا تو مل جائے گا۔''

''ملے گا کیوں نہیں؟ بھلا تلاش کریں اور نہ ملے۔''

''پھر ایسا کریں گے۔ جب اقبال چچا اپنے کمرے میں نہیں ہوں گے تو ان کے کمرے کی تلاشی لی جائے۔''

''ارے بھئی وہ کہیں جاتے بھی تو نہیں۔''

''دوپہر میں سوتے تو ہوں گے۔''

''ارے ہاں!'' شجی نے چٹکی بجائی۔'' دوپہر میں تو وہ ایسی گہری نیند سوتے ہیں کہ ان کے کان پر نقارہ بھی بجاؤ تو نہ اٹھیں۔

''بس تو پھر کیا ہے۔ہم سب چپکے سے ان کے کمرے میں داخل ہو کر نقشہ تلاش کریں گے ایک اور چار میں تو فرق ہوتا ہے نا۔

یوں تو شجی راستے بھر ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا، مگر وہ دل ہی دل میں بے حد پریشان تھا۔اُسے کیا معلوم تھا اظہر اس نقشے کے پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ چچا اقبال دوپہر میں گھر ہوتے ہی نہیں وہ تو اپنے دفتر میں ہوتے ہیں۔

اس نے تو ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا تھا۔رہی نقشے کی بات تو وہ سراسر شرارت تھی۔اچھا ہے تلاش کر کے خود ہی بے وقوف بنیں گے۔ لالچی کہیں کے۔

اسکول سے واپسی پر اتفاق سے چچا اقبال گھر ہی مل گئے۔وہ شمو، شنّی اور جمی کو لطیفے سنا رہے تھے۔

''ارے کیا ہوا؟ آج تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔'' شجی کو دیکھتے ہی چچا اقبال بولے۔

''ضرور آج اسکول میں بنچ پر کھڑے ہو کر آئے ہو۔''

''جی نہیں، آپ تو سب کو اپنا جیسا سمجھتے ہیں'' شجی نے برا سا منہ بنایا۔

''ارے بھائی تو ہوا کیا؟''

''کیا بتاؤں آپ کو۔؟ خواہ مخواہ مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔'' وہ بیٹھ کر جوتے کھولنے لگا۔

''وہ ہیں نا! اظہر اور اختر۔ انہیں اسکول سے روز بھاگ جانے کے سوا اور کوئی کام تو ہے نہیں، اب کل سے میرے سر ہیں۔''

''وجہ تو ہو گی کوئی؟''

''بات دراصل یہ تھی چچا جان! یہ اظہر ہر وقت ڈاکوؤں اور ان کے خزانوں کی بات کرتا رہتا ہے، وہ کہتا ہے اگر اُسے کسی ڈاکو کا چھپا ہوا خزانہ مل جائے تو وہ شہر کا سب سے بڑا رئیس بن جائے۔''

''ہوں۔ تو پھر؟''

''پھر کیا۔ یوں ہی مذاق میں، میں نے جھوٹ بول دیا کہ آپ کے پاس کسی خزانے کا نقشہ ہے۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ وہ نقشہ کسی طرح انہیں مل جائے۔ ہزار ٹالنا چاہا مگر وہ مانتے ہی نہیں۔''

''یہ تو تم نے بہت برا کیا۔'' اچانک چچا اقبال سنجیدہ ہو گئے......

تم نے ان لوگوں سے جھوٹ نہیں بولا۔خزانے کا نقشہ تو سچ مچ میرے پاس ہے۔"

"جی......؟"شجی حیرت سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

"ہاں سچ! اتنے بڑے خزانے کا نقشہ ہے میرے پاس کہ اس خزانے سے بڑا کوئی اور خزانہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تو آپ اس خزانے کو نکال کیوں نہیں لیتے ایک کوٹھی بنوا لیجئے۔ ایک کار......"

چچا اقبال عجیب سے انداز میں ہنسے "ارے بدھو، میں نے اس خزانے سے بہت کچھ نکال لیا ہے لیکن وہ ایسا انوکھا خزانہ ہے کہ اس میں سے چاہے جتنا نکال لو۔وہ کبھی کم نہیں ہوتا۔"

"آپ نے اس خزانے کا نقشہ کہیں چھپا کر رکھ دیا ہے......؟" شجی ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے تکنے لگا۔

"نہیں تو۔تم چاہتے ہو تمہیں مل جائے گا؟"

"مجھے......"شجی خوشی سے اچھل پڑا۔

"میں آج ہی وہ نقشہ تمہیں دے دوں گا۔تم اور تمہارے ساتھی اس کی مدد سے خزانے تک پہنچ سکتے ہیں" چچا اقبال عجیب سے انداز میں مسکرائے۔

"تم اپنے ساتھیوں کو دوپہر کو میرے پاس لے آنا، میں نقشہ تم لوگوں کے حوالے کر دوں گا۔"

شجی نے چچا اقبال کی بات پوری طرح سنی بھی نہیں اور تیزی سے باہر بھاگ گیا۔

دوپہر کو وہ اظہر، سلیم اور اختر کے ساتھ آیا تو چچا اقبال نے ایک لفافہ اسے دے دیا۔ اس نے جلدی سے وہ لفافہ کھولا، اندر سے کھلنے والے کاغذ پر ایک نقشہ بنا تھا۔ شجی نے جغرافیہ کے گھنٹے میں نقشوں پر بنائے جانے والے مخصوص نشانوں کے بارے میں پڑھا تھا۔ اس نقشے میں بھی کچھ ویسے ہی نشان بنے تھے۔

کچھ دیر کے بعد ہی وہ چاروں خزانے کی تلاش میں چل پڑے۔ اظہر کے ہاتھ میں کدال تھی اور اختر نے ایک پھاوڑا اُٹھا رکھا تھا۔ شجی ان سب سے آگے نقشہ ہاتھ میں لیے چل رہا تھا۔

"اب بیس قدم دائیں...... اب پچاس قدم بائیں.........."

وہ چاروں یوں نقشے کے سہارے چل کر اس جگہ پہنچ گئے جس جگہ نقشے میں خزانے کا نشان بنا تھا۔

"یہیں وہ خزانہ ہے۔" شجی بولا۔ اس کی آواز خوشی سے کانپ

رہی تھی۔اور دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

پھر سب کی نگاہ اس عمارت پر اٹک کر رہ گئی جس کے سامنے وہ کھڑے تھے۔

وہ عمارت ان کے اسکول کی عمارت تھی جس کے بورڈ پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا:۔''علم سب سے بڑا خزانہ ہے۔''

●●

(کھلونا، نئی دہلی)

پھول کی زندگی

اچانک روحی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سوتے سوتے ایک بہت ہی حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک روز اس نے اپنی ہم عمر ملازمہ سے کہا تھا کہ وہ اس کی ماں سے ملنا چاہتی ہے شمّو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا'' ماں بھی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں چھوٹی بی......' اور آج اس نے شمّو کی ماں کو خواب میں دیکھا تھا......

''لیکن......'' اچانک اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ یہ شمّو آج بھی نہیں آئی؟ اس خیال کے آتے ہی اس نے ایک نظر کمرے کی

طرف دیکھا۔ دروازہ اسی طرح بند تھا جیسا رات میں ڈیڈی بند کر کے گئے تھے......

روحی شمّو کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی یہ بات سب ہی جانتے تھے۔ شمّو نہ صرف اس کی خاص ملازمہ تھی بلکہ ہم عمر دوست بھی تھی۔ روحی کو گلاب کے پھول بہت اچھے لگتے تھے اور شمّو ہر صبح اس کے لیے تازہ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ بنایا کرتی تھی ...... ایسا خوبصورت گلدستہ کہ ہری ہری پتیوں کے درمیان پھول مسکراتے ہوتے تھے۔ روحی خود ہر آن مسکراتی رہتی ہے اور مسکراتے ہوئے لوگ اسے بے حد اچھے لگتے ہیں اور شاید اس کے ڈیڈی بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کی لاڈلی بیٹی ہمیشہ یونہی مسکراتی رہے۔ اس لیے انہوں نے صرف روحی کے لیے شمّو کو ملازم رکھا ہے، اگر روحی اس کی طرف دیکھتی بھی ہے تو وہ پھول کی طرح مسکرا دیتی ہے۔ روحی اسے کسی کام کے لیے پکارتی بھی ہے تو وہ مسکراتی ہوئی چلی آتی ہے۔

روحی کی پیدائش کے چند ماہ کے بعد ہی اس کی امی جان اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ اور اس کی پرورش شمّو کی ماں نے کی تھی۔ شمّو کی ماں اس کی امی جان کی خاص ملازمہ تھی۔ کہتے ہیں کہ روحی جب پالنے میں لیٹی رہا کرتی تھی تو لیٹی لیٹی مسکراتی رہا کرتی۔ وہ کبھی نہیں روتی تھی...... جیسے

رونا اسے آتا ہی نہ ہو۔ اس کے ڈیڈی اسے دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے تھے اور اسی روز سے انہوں نے طے کرلیا تھا کہ وہ اپنی مسکراتی بیٹی کے سامنے کبھی کوئی غم آنے نہیں دیں گے۔ اس لیے انہوں نے شمّو کی ماں کو حکم دے دیا تھا کہ وہ روحی کے سامنے صرف مسکراتی رہا کرے۔

روحی بڑی ہوئی تو ساتھ ہی ساتھ اس کے ڈیڈی کا پیار بڑھتا گیا۔ اس کے کھیلنے کے لیے کوٹھی کے لان کو مخملی گھاس سے آراستہ کیا گیا۔ کیاریوں میں غازی پوری گلاب کے پودے لگائے گئے۔ جب وہ بڑی ہوئی تو آنے جانے کے لیے ایک خوبصورت سی کار بھی آ گئی۔

روحی کے ڈیڈی رحمان صاحب شہر کے امیر ترین لوگوں میں ایک تھے۔ دولت کی انتہا نہ تھی...... اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے وہ اپنی دولت پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ کوٹھی میں نوکروں کی ایک فوج تھی۔ ہر ملازم کے ذمہ الگ الگ کام تھا۔ روحی کے ایک اشارے پر وہ سب دوڑتے چلے آتے۔

نتیجہ یہ ہوا روحی آہستہ آہستہ بد دماغ اور بد اخلاق ہوتی گئی۔ وہ عام بچوں کو اپنی کوٹھی میں گھسنے تک نہ دیتی...... ملازموں کو ڈانٹتی پھٹکارتی اور ان پر حکم چلاتی اور اگر کوئی ذرا اس کے حکم کی تعمیل نہ کرتا تو بس اس کی خیر نہیں ہوتی۔ وہ تمام دن جھلائی جھلائی رہتی............

رحمان صاحب دولت مند ضرور تھے، لیکن بہت سنجیدہ مزاج اور دور اندیش۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ اس طرح تو روحی کا مزاج بگاڑ دیں گے۔ اس لیے انہوں نے شمّو کی ماں کو حکم دیا کہ وہ روحی کی ہر ضرورت کا خیال رکھے تا کہ اسے کسی اور ملازم کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔ شمّو کی ماں ہر صبح اس کے لیے مسکراتے ہوئے پھولوں کا گلدستہ بناتی اور اس کے جاگنے سے پہلے ہی مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی، اسے جگاتی اور مسکراتے ہوئے وہ گلدستہ اسے پیش کر دیتی۔ اور یوں مسکراہٹوں کے ساتھ روحی کا ہر نیا دن شروع ہوتا۔

ایک روز شمّو کی ماں شدید بیمار ہوگئی۔

ایک دن تو کسی طرح گذر گیا۔ لیکن دوسرے روز رحمان صاحب کو بے حد فکر ہوئی۔ کیونکہ روحی پہلی بار دن بھر پریشان رہی تھی، وہ بالکل نہیں مسکرائی تھی۔ حالانکہ انہوں نے روحی کو طرح طرح کے لطیفے سنائے تھے۔ ہر طرح ہنسانے کی کوشش کی تھی۔

رحمان صاحب فکر مند ہو کر اپنی موٹر دوڑاتے شمّو کے گھر تک آئے تھے۔ شمّو کی ماں سخت بیمار تھی۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ تھی...... جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو ایک معصوم سی لڑکی نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔

اس لڑکی کی مسکراہٹ سے وہ جان گئے کہ وہ ان کی ملازمہ ہی کی لڑکی ہوسکتی تھی...... کیونکہ ان کی ملازمہ کے مسکرانے کا بالکل ویسا ہی انداز تھا۔

رحمان صاحب کو اپنی پریشانی کا حل مل گیا۔

''کیوں رشیدن میں تمہاری لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ تم بیمار ہو اور یہ روحی کے ساتھ رہے گی تو اس کی زندگی سنبھل جائے گی۔''

رحمان صاحب نے شمّو کی ماں سے کہا......

وہ بے چاری کیا کہتی! مالک کا حکم۔ اس نے اقرار کرلیا اور اس روز شمّو پھول کی طرح مسکراتی ہوئی کوٹھی میں آ گئی...... روحی کو مسکرانے والا ایک اور ساتھی مل گیا۔ شمّو دن بھر اپنی مسکرانے کی ملازمت کرتی اور شام کو اپنی بیمار ماں کے پاس چلی جاتی۔

ہر صبح روحی کے جاگنے سے پہلے وہ پھولوں کا گدستہ بناتی اور ان پھولوں کی طرح خود بھی مسکراتی ہوئی کمرے میں آ کر روحی کو جگاتی۔ وہ جاگتی تو شمّو گلدستہ پیش کردیتی۔ روحی پھول لے کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتی جس پر صرف مسکراہٹ ہوتی، اور پھر خود بھی مسکرا دیتی۔ اور یوں ہر نیا دن مسکراتا ہوا شروع ہوتا۔

ایک دن ناشتہ کرتے کرتے اچانک روحی نے معلوم کیا ''تیری

ماں کیسی ہے شمّو۔''

وہ بیمار ہیں چھوٹی بی.....'' وہ روحی کو چھوٹی بی کہا کرتی تھی۔

''تجھے بہت پیار کرتی ہیں۔''

''ہاں بہت پیا کرتی ہیں۔''

''اچھا ایک بات تو بتا۔'' اسے نہ جانے کیا خیال آیا۔'' تیرا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

'' معلوم نہیں ...... میں یہاں تک آتے آتے تھک جاتی ہوں چھوٹی بی۔''

''اتنی دور!'' اسے تعجب ہوا'' میں تیری ماں کو دیکھنے چلتی۔''

''وہ کسی دن یہیں آجائیں گی۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔''

پھر ایک دن روحی کو خیال آگیا'' تیری ماں بہت اچھی ہیں، مجھے بہت یاد آتی ہیں شمّو۔''

''میں نے آپ کی بات کہہ دی تھے۔''

''اچھا! آئیں گی وہ؟''

''ہاں کیوں نہیں؟'' وہ مسکراتی ہوئی بولی'' ایک بات بتاؤں چھوٹی بی؟ وہ بھی آپ کو یاد کرتی ہیں۔''

''ارے اپنی تو ماں ہی نہیں شمّو۔'' اچانک وہ اداس ہو گئی۔ تو بہت خوش قسمت ہے۔ اپنی تو قسمت......''

ارے ارے چھوٹی بی...... کہیں ایسی باتیں کرتے ہیں، میری ماں تو کہتی ہے، اس کی دو بیٹیاں ہیں، ایک میں......اور دوسری آپ......''

سچ شمو...... روحی خوش ہو گئی۔ وہ یوں مسکرائی جیسے کسی نے کوئی خوبصورت سا تحفہ دے دیا ہو۔ مجھے ماں کے پاس لے چلنا۔ سچ آج وہ بہت یاد آ رہی ہیں۔

''کل چلیے......کل لے چلوں گی میں آپ کو۔''

روحی تمام رات میٹھے میٹھے خواب دیکھتی رہی، اور خواب میں اس کی ماں لوریاں سنا سنا کر اسے تھپکتی رہی ......اور وہ چونک چونک کر آنکھ کھول دیتی، کیونکہ خواب میں نظر آنے والی اس کی ماں اور کوئی نہیں۔ شمّو کی ماں تھی۔ اسے دن نکلنے کا انتظار شدّت سے ستانے لگا۔

دن نکلنے پر وہ کافی دیر تک بستر میں یونہی لیٹی رہی اور شمّو کا انتظار کرتی رہی، رحمان صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دفتر چلے بھی گئے، مگر شمّو نہیں آئی۔ وہ جھلا کر بستر سے اٹھ گئی۔ پھر اس نے زور زور سے شمّو کو پکارنا شروع کر دیا، مگر شمّو نہیں آئی، ایک اور ملازم منہ بناتا ہوا آ گیا۔

''شمّو کہاں ہے؟ وہ چلائی۔''

''وہ آج نہیں آئی مالکن۔''

''کیوں نہیں آئی۔''

''معلوم نہیں۔''

''کیوں معلوم نہیں''

اس نے ایک تکیہ اٹھا کر ملازم کے کھینچ مارا۔ دوسرا اٹھایا ہی تھا کہ وہ کھسک گیا اور اس نے فوراً ہی رحمان صاحب کو فون کر دیا۔

''رحمان صاحب تھوڑی دیر بعد فکر مند ہو کر گھبرائے گھبرائے روحی کے کمرے میں پہنچے۔ روحی تکئے میں منہ چھپائے پڑی تھی......

''ارے ہماری بیٹی کو کیا ہوا؟''

''اونہہ، ڈیڈی آج شمّو نہیں آئی۔''

''ارے......کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ ہم اپنی بیٹی کو پھولوں کی کہانی سنائیں گے۔''

''ہم نہیں سنیں گے، شمّو کیوں نہیں آئی؟ وہ بدستور مچلتی رہی۔

''آئے گی بیٹے، ضرور آئے گی، ہم اسے سزا دیں گے ہماری بیٹی کو پریشان کر دیا۔''

بڑی مشکل سے روحی کو سکون ملا۔

اگلی صبح روحی کی آنکھ کھلی تو بھی شمّو موجود نہیں تھی وہ جھلا کر بستر سے اُٹھ جانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اسے باہر ڈیڈی کے زور سے بگڑنے کی آواز سنائی دی۔

شمّو اس وقت کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہی ہوئی تھی۔ رحمان صاحب لان میں ٹہل رہے تھے۔

کل کہاں مرگئی تھی؟'' رحمان صاحب نے اسے ڈانٹا...... وہ سہم گئی۔

''تیری ماں کو اچھی طرح معلوم ہے پھر اس نے روک لیا۔''

''جی وہ...... وہ...... ماں'' وہ نہ جانے کیا کہتے کہتے رک گئی۔

'' ماں کی بچی ...... چل چل جا کر روحی کو جگا۔ اس کے جاگنے کا وقت ہو گیا۔''

شمّو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی پھول توڑنے لگی، اور گلدستہ بنا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ روحی بستر پر بیٹھی اس کو گھور رہی تھی۔ شمّو مسکرانا بھی بھول گئی۔

''تم کل نہیں آئیں میں تمام دن پریشان رہی۔''

''مجھے معلوم ہے چھوٹی بی۔'' وہ آہستہ آہستہ روحی کی طرف بڑھی

اور گلدستہ اس کی طرف بڑھادیا۔ پھر اسے خیال آیا، مسکرانا بھی ہے، وہ مسکرادی۔

''تمہاری یہ بات اچھی نہیں ہے، جانتی ہو تمہارے بغیر دل نہیں لگتا۔''

''مجھے معاف کردیجیے۔'' وہ مسکراتی رہی پھر روحی بھی مسکرادی۔

کچھ دیر بعد ناشتہ کرتے کرتے روحی نے شمّو سے کہا: ''میں نے اس روز تمہاری ماں سے ملنے کے لیے کہا تھا، میں دودن سے روز تمہاری ماں کو خواب میں دیکھ رہی ہوں، میرا ان سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے، آج لے چلوگی نا؟''

اب وہ نہیں مل سکتیں چھوٹی بی۔''

''کیوں'' روحی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کل وہ مر گئیں۔'' شمّو ایک لمحہ کے لیے اداس ہوگئی اور پھر وہ زبردستی مسکرادی۔

روحی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرگئی۔ اور وہ حیرت زدہ سی شمّو کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اتنے بڑے حادثہ کی خبر اس نے ایک معمولی بات کی طرح بتادی تھی۔

روحی کی پلکوں پر آنسو چھلک آئے۔اس نے اپنی بھیگی پلکوں کے پیچھے سے ایک بار پھر شمو کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی ۔ ہری ہری پتیوں کے درمیان سے جھانکتے ہوئے پھولوں کی طرح۔

●●

(نور-رامپور)

سبق

پاپا نے گھر آتے ہی چچا اقبال کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

چچا اقبال اچانک اس ڈانٹ پھٹکار سے حیرت زدہ ہو کر کبھی پاپا کو دیکھتے اور کبھی امی کی طرف، امی بیچاری پہلے ہی سہمی کھڑی تھیں۔ پھر انہوں نے بڑی ہمت کے بعد کہا۔

''جوان بھائی کو اس طرح ڈانٹنا کیا اچھا لگتا ہے؟''

''تم خاموش رہو۔ ان حضرت نے بچوں کو دو کوڑی کا کر دیا ہے۔''

پاپا کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔

''آخر کچھ ہوا بھی یا یونہی......؟'' امی دونوں کے درمیان آئیں۔

''شوکی کہاں ہے......؟'' پاپا نے اس بار امّی سے معلوم کیا۔

''وہ تو اپنے کسی دوست کے یہاں پڑھنے گیا ہے۔''

پاپا جھلائے۔ ''وہ ریگل میں فلم دیکھ رہا ہے۔ ان بزرگوار نے اسے فلمیں دکھا دکھا کر اب اس قابل کر دیا ہے کہ وہ گھر سے بہانے بنا کر فلم دیکھنے جانے لگا ہے۔''

''لیکن بھائی صاحب آج تو......''

''خبردار جو آج سے تم نے میرے کسی بچے کو کوئی پیسہ دیا یا انہیں گھمانے لے گئے۔'' اور پاپا پیر پٹکتے ہوئے غصّے میں بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

چچا اقبال کو سکتہ سا ہو گیا۔ انہیں اپنی بہت سی غلطیوں کا احساس ہونے لگا۔ دراصل وقت کے ساتھ ہر کام اچھا ہوتا ہے۔ چوری چھپے کا ہر کام بُرا ہے۔ آج شوکی بہانہ بنا کر اپنے کسی دوست کے ساتھ فلم دیکھنے گیا ہے۔ کل اس دوست کو فلم دکھانی بھی پڑے گی۔ تب اور کوئی بہانہ بنے گا۔ فلم کے نام پر پیسے گھر سے مل نہیں سکتے تو جیب خرچ میں ہیرا پھیری کرنی پڑے گی۔ اور جب یہ سلسلہ جاری رہے گا......تب؟

چچا اقبال رو پڑے۔

وہ شوکی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ شاید پاپا اور امی سے بھی زیادہ اس کے اندر وہ تمام خوبیاں دیکھا کرتے تھے جو اچھے لڑکوں میں ہوتی ہیں ...... وہ پڑھائی میں بہت تیز تھا اور کھیل کود میں بھی، چچا اقبال اس کی ہر ترقی پر خوش ہوتے تھے۔ اگر وہ کوئی اچھی تصویر بناتا تو اسے دل کھول کر داد دیتے، اس کی ہمت بڑھاتے، وہ کیرم کا میچ جیت جاتا تو اس کی کمر ٹھونکتے اور اگر وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا تو مٹھائی بانٹتے۔

اچانک کال بیل کی آواز سن کر چچا اقبال چونکے۔ انہوں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ شوکی کا ایک اور دوست راشد کھڑا تھا۔

''شوکی ہے انکل؟'' اس نے سلام کے بعد کہا

''نہیں وہ تو نہیں ہے...... کیوں......؟''

''جی۔ جی وہ اس کو یہ جغرافیہ کی کتاب دینی تھی۔''

''مجھے دے دو، میں دے دوں گا۔'' چچا اقبال نے وہ کتاب لے لی۔ راشد چلا گیا اور وہ دروازہ بند کر کے اندر آ گئے اور کتاب میز پر رکھ دی۔ اور وہیں کرسی پر بیٹھ گئے۔ گھڑی میں چھ بج رہے تھے۔

''فلم ختم ہو گئی ہو گی شوکی آتا ہو گا۔'' انھوں نے گھڑی سے نگاہ ہٹا

کر پاپا کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ''معلوم نہیں آج کتنی مار پڑے بچارے پر''...... پھر وہ کچھ سوچ کر اٹھے اور آہستہ آہستہ چل کر پاپا کے کمرے میں آئے۔

''بھائی صاحب!''......انھیں اپنی ہی آواز حلق میں پھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔ پاپا نے کچھ غصّے سے دیکھا۔

''خدا کے واسطے آپ شوکی سے کچھ نہ کہیں۔ میں اسے سمجھادوں گا۔''

پھر وہ آہستہ سے بولے۔

تمہاری انہی باتوں نے تو اسے بگاڑ دیا ہے اقبال۔'' پاپا بھڑک اُٹھے۔ ''میں اپنے بیٹے کو اپنے سامنے یوں آوارہ لڑکوں کی طرح بگڑتا ہوا کیسے دیکھ لوں۔ لاڈ پیار کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ یوں چوری چھپے فلمیں دیکھ کر پیسہ برباد کرے۔''

''اب چھوڑیئے بھی وہ آئے گا تو سمجھا دیں گے۔'' امی پاپا کو تسلی دینے لگیں۔

جب ہی کال بیل بجی۔ امی نے جا کر دروازہ کھولا۔ شوکی تھا۔

چچا اقبال پاپا کے پاس بیٹھے رہے۔ امی نے شوکی کو کھانا دیا۔ اور جب وہ کھانا کھا کر کچن سے اپنے کمرے میں چلا گیا تب چچا اقبال کی جان

میں جان آئی۔ وہ کمرے میں آئے اور میز سے وہ کتاب اٹھائی جو راشد دے گیا تھا۔ پھر غیر ارادی طور پر انھوں نے وہ کتاب کھول لی۔ وہ جغرافیہ کی کتاب کا کور چڑھا جاسوسی ناول تھا۔

چچا اقبال کو دھکّا سا لگا۔ بات بہت آگے نکل گئی ہے اس بار شوکی پاس نہیں ہو سکے گا۔ یہ سوچ کر انھیں بہت دکھ ہوا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ بچے کو جس کام سے سختی کے ساتھ روکا جائے وقتی طور پر اُسے نہ کرے لیکن اس کے دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کام کیسا ہے جس سے روکا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ جس طرح شوکی ان غلط راہوں کی طرف بڑھا ہے، اس کو اسی طرح روکنا بھی ہوگا۔ اور یہ ایک روز کی سختی سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اسے اتنا وقت اور مہلت ہی نہ دی جائے کہ وہ فلموں یا جاسوسی ناول کے بارے میں سوچے۔

غالباً چچا اقبال نے اپنے دل میں کوئی ترکیب سوچ لی تھی۔ وہ خاموشی سے وہ کتاب شوکی کو دے کر اور پڑھنے کو کہہ کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔

کئی دن گذر گئے۔

اور گذرنے والے ان دنوں میں امی نے اور چچا اقبال نے شوکی کو کسی نہ کسی بہانے زیادہ وقت تک الجھائے رکھا اور شوکی زیادہ وقت گھر

ہی میں رہا۔ سب کو اطمینان ہو گیا کہ وہ ایک اتفاق تھا۔ اپنے کسی دوست کے بے حد اصرار پر چلا گیا ہوگا۔ ورنہ شوکی ایسا نہیں ہے۔

پاپا نے ایک دن اچانک بتایا کہ ان کے کسی دوست کی بیٹی کی شادی ہے۔ اور انھیں شرکت کرنے لکھنؤ جانا ہے۔ شوکی کے ششماہی امتحان چل رہے ہیں اس لئے وہ نہیں جا سکے گا۔ رہے چچا اقبال تو انھیں شوکی کی وجہ سے گھر رہنا پڑے گا۔ امی اور پاپا رات کو ایک بجے میل سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گئے۔

اس روز شوکی کا کوئی پرچہ نہیں تھا۔ عبدل ناشتہ تیار کر رہا تھا اور چچا اقبال ڈرائنگ روم میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

ناشتے کے بعد چچا اقبال اچانک اُٹھ گئے، اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگے۔

''آپ کہیں جا رہے ہیں چچا جان؟'' شوکی بولا۔

''ہاں، لیکن تھوڑی دیر کے لیے۔'' چچا اقبال عجیب سے انداز میں بولے۔

''کیوں، تم کیوں معلوم کر رہے ہو؟''

''جی مجھے ایک دوست کے یہاں اسٹڈی کے لئے جانا تھا۔''

شوکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم میرے ساتھ چلو میں موٹر سائیکل سے تمہیں تمہارے دوست کے یہاں چھوڑ دوں گا۔"

"جی مجھے کہیں دور تو نہیں جانا......بس راشد......"

"اچھی بات ہے......" چچا اقبال چلے گئے۔

اور جب ان کی موٹر سائیکل کی آواز دور جا کر ختم ہوگئی تو شوکی نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ کل راشد سے صبح کا شو دیکھنے کی بات ہوئی تھی اور وہ بھی جاسوسی۔ بس مزہ آجائے گا۔ وہ جلدی جلدی راشد کے گھر کی طرف بڑھتا گیا۔

فلم واقعی بڑی بھیانک اور پُراسرار تھی۔ وہ دونوں جب فلم دیکھ کر باہر آئے تو بھی ان کے دل میں خوف سا تھا۔ ایسی فلم ان لوگوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ابھی وہ دونوں سڑک پر آئے ہی تھے کہ ایک بھاری بھرکم سا آدمی ان کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

"تم دونوں میں شوکی کون ہے......"

"کہئے......میں ہوں......"

"جلدی چلو، تمہارے چچا کا ایکسیڈینٹ ہوگیا ہے۔" وہ آدمی

گھبرا کر بولا۔

''ارے کہاں ہیں وہ......؟'' شوکی کے تو ہوش ہی گم ہو گئے۔

''آؤ میرے پاس کار ہے......جلدی آؤ۔''

شوکی یہ بھی بھول گیا کہ اس کے ساتھ راشد تھا۔ اُسے تو اس وقت خیال آیا جب کار چل پڑی کہ راشد وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ راستے بھر چچا کے بارے میں سوچتا رہا، پتہ نہیں کیا حال ہو گا۔ پاپا نہیں ہیں۔ اب وہ کیا کرے گا۔ یہ آدمی کتنا اچھا ہے کہ مجھے تلاش کرتا کرتا یہاں تک آ گیا۔

اچانک کار رُک گئی، اور شوکی چونک پڑا۔

''یہاں کہاں ہیں چچا جان۔'' شوکی کار سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دور تک ویرانہ تھا۔ قریب ہی پرانے قلعے کے کھنڈر تھے۔

''چپ چاپ چلے آؤ'' ......وہ آدمی غرایا......اس کے ہاتھ میں چھرا تھا۔

شوکی کانپ کر رہ گیا۔ تو یہ کوئی غنڈہ ہے اور اسے بہکا کر یہاں لے آیا ہے۔ اسے سمجھتے دیر نہیں لگی۔ اس نے کتنے ہی ناولوں میں ایسے واقعات پڑھے تھے اور آج جو فلم دیکھی تھی اس میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ بری طرح

خوف زدہ ہوگیا، دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

''چلو''...... وہ آدمی پھر غرایا۔

وہ اب اس کے سوا اور کیا کرتا کہ چپ چاپ چل دے۔

کھنڈر میں دو آدمی اور تھے۔

''لے آئے......''

''ہاں استاد ...... لے آیا۔''

''ٹھیک ہے باندھ دو...... اس کے باپ کے پاس بہت پیسہ آ گیا ہے شاید۔ تب ہی تو یہ روز روز فلم دیکھتا ہے۔'' دوسرا آدمی بولا، اور اس نے رسّی کا لچھا پہلے کی طرف پھینک دیا...... ''کیوں بے'' ...... پھر وہ اس سے بولا ...... ''یہ روز روز پکچر دیکھنے کو پیسے کہاں سے آتے ہیں'' ...... وہ چپ رہا۔

''اُستاد، چوری کرتا ہوگا۔ کوئی باپ روز روز فلم کے لئے پیسے نہیں دے سکتا۔'' دوسرا بولا۔

''ٹھیک ہے...... بچُّو سے چوری کرایا کریں گے۔''

''استاد، ابھی چھوٹا ہے۔ پولس پکڑ لے گی تو بھاگ بھی نہیں سکے گا ...... جیب کاٹنا سکھا دو۔''

شوکی کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔

''اس کے خاندان کی عزت مٹی میں مل جائے گی اور پاپا تو خودکشی کرلیں گے۔''

''مجھے چھوڑ دو...... میں نے کبھی چوری نہیں کی......'' وہ رو پڑا۔

''سن لو بھئی...... کہتا ہے چوری نہیں کی...... کتاب بیچی ہوگی......؟''

''استاد ہمیں کیا کچھ بھی کیا ہوگا۔ اس کا باپ بہت شریف آدمی ہے۔'' اس بار تیسرا بولا...... ''اس کی وجہ سے اسے بہت دکھ ہوگا۔''

''پھر کیا کریں......؟''

''اس سے ایک تحریر لکھوالو...... اور پھر اس تحریر سے اس کے باپ سے دس ہزار روپے مل سکتے ہیں......''

''تم ٹھیک کہتے ہو...... وہ اسے چھڑانے کے لئے دس ہزار دے گا۔''

اور پھر کاغذ اور قلم آیا۔ اور اسے چھرا دکھا کر تحریر لکھوائی گئی۔

''بس بچو، اب تم آزاد ہو ...... مگر رہو گے یہیں۔ ہم تمہارے گھر جارہے ہیں۔ روپے...... مل جائیں گے تو چھوڑ دیں گے۔''

وہ چاروں اسے ایک ستون سے باندھ کر باہر نکل گئے۔

اور وہ کھڑا کھڑا روتا رہا۔

''پاپا گھر نہیں ہیں، چچا جان صبح سے کہیں گئے ہیں۔ گھر کوئی نہیں

ہوگا۔اوراُسے کون چھڑائے گا۔''

اُس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو ہلانا چاہا مگر بندش مضبوط تھی ہاتھ ہلے بھی نہیں، وہ بے تحاشہ رونے لگا۔

جب ہی باہر موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی اور پھر قریب آکر تھم گئی۔ اور پھر چچا اقبال کی آواز سنائی دی۔وہ اُسی کو پکار رہے تھے۔

مگر وہ بجائے جواب دینے کے اور بھی زور زور سے رونے لگا۔ نہ جانے کیوں اس کا دل اب اور بھی رونے کو چاہنے لگا تھا۔ چچا اقبال دوڑے دوڑے اس کی طرف آئے اور پھر انھوں نے جلدی ہی اس کو آزاد کر دیا۔اور وہ چچا اقبال سے لپٹ کر رو پڑا۔

''اب کیوں روتے ہو......دس ہزار روپے دے کر تمھیں بچایا ہے۔''

وہ اور بھی زور سے رویا۔جیسے اسے سوائے رونے کے اور کچھ بھی سوجھ نہیں رہا تھا۔

''اور دیکھو بہانے بنا کر فلمیں......ہم سمجھتے رہے تم اسٹڈی کر رہے ہو اور ہوا......یہ......؟ اگر صحیح بات معلوم ہوتی تو یہ دس ہزار جاتے۔''

''مجھے معاف کر دیجیے مجھے معاف کر دیجیے۔

اب کبھی ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ چچا اقبال کے سینے سے لگا روتا رہا۔

"چلو معاف کیا۔ تم اپنی غلطی پر شرمندہ ہو۔ لو یہ اپنی تحریر اسے پھاڑ کر پھینک دو۔"

چچا اقبال نے وہی کاغذ جیب سے نکال کر اسے دے دیا جس پر اس نے پاپا کے نام خط لکھا تھا......

اور پھر وہ چچا اقبال کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر آ گیا۔

آج شوکی بالکل بدل چکا ہے۔ اپنی عمر کے مطابق وہی ہلکی پھلکی شرارتیں اس کا محبوب مشغلہ ہے اور وہ فلم دیکھنے کے نام سے چڑتا ہے۔

لیکن اُسے آج تک چچا اقبال نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ یہ خطرناک ڈرامہ انھوں نے ہی کھیلا تھا، اور وہ غنڈے ان کے بہت ہی شریف دوست تھے۔

●●

(نور - رامپور)

دوسرا رخ

امی جب تیار ہو کر چل پڑیں تو فہیم نے ان کا راستہ روک لیا۔ امی نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''کیوں۔؟ کیا بات ہے۔؟''

''میں نے کہا تھا نہ امی۔ آج آپ اپنی سب سے اچھی ساڑی پہن کر چلیں۔'' وہ بولا۔

''ہم غریب لوگ ہیں بیٹے۔ اس سے اچھی ساڑی میرے پاس اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔'' امی نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا۔

''اوہ امی، غریب ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی تو نہیں ہے کہ ہم

سب کو اپنی غربت دکھائیں ہی۔''

''اب آخر تمہارے دوست کے گھر ہی تو چلنا ہے۔ کسی غیر جگہ تو نہیں پھر......'' امی نے آہستہ سے جواب دیا اور چل پڑیں۔ فہیم بھی ان کے ساتھ چلتا رہا۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ مجبوراً جا رہا ہو۔ اس کے دل میں اب وہ پہلا سا جوش تھا ہی نہیں۔ مرے مرے بوجھل قدم اُٹھاتا وہ امی کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

ہوا یہ تھا کہ جن دنوں فہیم نے اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ انہی دنوں اس کی دوستی امجد سے ہو گئی تھی۔ فہیم کو ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا۔ حالانکہ گھر کے لوگوں کے علاوہ اس کے اس شوق کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کسی دوست کو بھی یہ خبر ہو اور اگر وہ ڈاک ٹکٹ جمع کرنے لگے تو ان کے پاس ایسے ٹکٹ آ جائیں گے جو فہیم کے پاس نہ ہوں۔ دراصل دنیا کے ہر بچے کی طرح اس کے دل میں بھی ویسا ہی جذبہ تھا کہ کوئی اس سے آگے نہ بڑھ جائے۔ اسی لیے وہ اپنے اس شوق کو سب سے چھپاتا تھا۔ اور اگر کسی کو معلوم بھی ہو جاتا تو اسے اپنی ٹکٹوں کی البم تو دکھاتا ہی نہیں تھا۔ لیکن امجد سے دوستی کا سبب بھی اس کا یہی شوق تھا۔

ایک دن وہ جب اپنی سیٹ سے اُٹھ رہا تھا تو بے دھیانی میں اس کا ہاتھ قریب ہی کھڑے ہوئے امجد کی کتابوں میں لگ گیا اور کتابیں گر پڑیں ۔ کتابیں گریں تو ایک کاپی کے کچھ ورق بھی کھل گئے اور ان میں سے بڑے خوبصورت خوبصورت ڈاک ٹکٹ نکل کر فرش پر بکھر گئے ۔

امجد نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور پھر وہ ڈاک ٹکٹ بھی ۔

''معاف کرنا بھائی، میں نے جان کر ہاتھ نہیں مارا۔'' فہیم نے آہستہ سے کہا۔ اس کے لہجہ میں شرمندگی تھی ۔

''کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے ۔''

''یہ ٹکٹ تو بہت خوبصورت تھے ۔ کہاں سے آئے ؟''

''میرے یہاں تو لفافوں پر لگ کر آتے رہتے ہیں ۔'' امجد نے اسے بتایا ۔

چھٹی ہو چکی تھی اور سب باہر جا رہے تھے ۔ یہ دونوں بھی باتیں کرتے باہر نکل آئے ۔

''میں نے ایسے ٹکٹ پہلے نہیں دیکھے ۔ ویسے میرے پاس بھی بہت سے ٹکٹ ہیں ۔''

''اچھا......'' امجد نے اچھا، کو ذرا کھینچ کر کہا۔ جیسے اسے اس اطلاع

پر حیرت ہوئی ہو۔ ’’لیکن یہ ٹکٹ تمہارے پاس بالکل نہیں ہوں گے۔‘‘

’’نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ ممکن ہے ہوں۔ میں دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔‘‘

چلتے چلتے امجد رک گیا، پھر اس نے وہ کاپی نکالی جس میں وہ ٹکٹ رکھے تھے۔ فہیم نے ایک ایک ٹکٹ دیکھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ سب ٹکٹ اس کے پاس کی البم میں تھے۔

یہ سب تو میرے پاس ہیں...... ‘‘ پھر فہیم نے ٹکٹ لوٹا دیے۔

’’اچھا تو کل میں تمہیں اور ٹکٹ دوں گا...... جو یقیناً تمہارے پاس نہیں ہوں گے۔‘‘

’’ہاں نئے ٹکٹ دینا مجھے...... مجھے بڑا شوق ہے ٹکٹ جمع کرنے کا۔‘‘

’’بھئی شوق تو مجھے بھی تھا......‘‘ وہ دونوں پھر چل پڑے...... ’’مگر ایک دن کیا ہوا، الماری میں دیمک لگ گئی اور میری البم بھی چاٹ ڈالی۔ بس جب سے دل ہی نہیں چاہتا۔ ٹکٹ تو روز ہی آتے ہیں......‘‘ امجد بتانے لگا۔

’’مگر آتے کہاں سے ہیں؟‘‘ فہیم کو اشتیاق ہوا۔

’’بھئی میرے ابا کی برتنوں کی بہت بڑی دوکان ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ملکوں سے تجارت ہوتی ہے۔ بس انھیں ملکوں سے جو ڈاک آتی

ہے نا، تو ان لفافوں پر ہوتے ہیں یہ ٹکٹ ......'' امجد نے اسے مزید بتایا۔

''میں تو بس بانٹ دیتا ہوں۔''

دوسرے دن امجد نے اسے ٹکٹ دیے ...... اور یوں وہ دونوں دوست ہو گئے۔

اب بھئی تم سب ہی جانتے ہو دوست تو پھر دوست ہوتے ہیں۔ وہ دونوں زیادہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہنے لگے۔ جب زیادہ وقت ساتھ گذرتا تو یہ ضروری تو نہ تھا کہ بات صرف ٹکٹوں کی ہی کی ہوا کرتی۔ باتیں تو بہت ہوتی ہیں۔ اب ان دونوں کے درمیان بھی ٹکٹوں کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہونے لگیں۔

''امجد ایک دن بہت خوبصورت شرٹ پہن کر آیا تو اس نے بتایا کہ اس کے ابا اس بار جب اپنی تجارت کے سلسلہ میں امریکہ گئے تھے، تب لائے تھے۔

ایک دن اس نے اپنا ٹائی پن دکھایا...... وہ جاپان کا تھا۔

اور سوٹ کا کپڑا مانچسٹر کا تھا اور جوتے روس کے۔

گھڑی سوئزرلینڈ کی تھی اور اس کی چین کویت سے خریدی گئی تھی۔

بس گڑبڑ یہیں سے شروع ہو گئی۔

ٹکٹوں کی بات اور تھی ...... فہیم ٹکٹ دیکھ کر بہت سے ٹکٹوں کے بارے میں کہہ دیا کرتا تھا کہ یہ تو اس کے پاس ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں ایسی تھیں جن کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ خود کو اتنا غریب بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اور امجد سے کم درجے کا بھی نہیں ...... اس لیے اس نے سوچا، اسے بھی کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیے۔

وہ دونوں اسکول جا رہے تھے۔ امجد اس روز بھی ایک نئے سوٹ میں تھا۔

''اچھا ...... یہ سوٹ تم نے کب سلوایا ......؟'' فہیم نے اس کے شانے پر کپڑا چھونے کی غرض سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ارے بھئی کیا بتاؤں ...... مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ابا اس بار بھی میرے لیے سوٹ کا کپڑا لائے ہیں۔'' امجد بتانے لگا۔ ''میں تو سمجھا تھا ابا اس بار گھر کے دوسرے لوگوں کے لیے سامان لائے ہوں گے۔ مگر یہ تو جب معلوم ہوا جب ٹیلر نے سوٹ کی ٹرائی کے لئے بھیجا۔''

فہیم ہنس پڑا۔

''عجیب قسمت ہے تمہاری بھی۔ ایک ہمارے پاپا ہیں، انکل نے گلاسکو سے خط لکھا تھا کہ وہ ہندوستان آنے والے ہیں، جو کچھ منگانا ہو لکھ

دیں...... مگر واہ......'' فہیم پھر ہنسا

امجد نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''پاپا نے صاف لکھ دیا، یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بس تم آجاؤ، ہماری خوشی یہی ہے۔''

''تمہارے انکل گلاسکو گئے کب ہیں۔؟''

ارے بھئی وہ تو رہتے ہی وہیں ہیں۔ ایک انکل ارجنٹائنا میں ہیں۔''

''اچھا......''

''ہاں پچھلی بار جب وہ آئے تھے تو نہ جانے کیا کیا الم غلم لے آئے تھے، کپڑا، جوتے اور نہ جانے کیا کیا...... مگر پاپا نے کچھ بھی نہیں لینے دیا۔ کہہ دیا، ہمیں اپنے ہی ملک کی بنی ہوئی چیزیں زیادہ پسند ہیں۔'' فہیم نے بڑی بے دلی سے کہا۔

''ہاں خیر...... یہ بات تو ہے۔'' امجد بولا۔ اب تو ہمارے ملک میں بھی بہت سی اچھی اچھی چیزیں بننے لگی ہیں۔ لیکن جو کوئی چیز اتنی دور سے لاکر دے اس کی بات ہی اور ہوتی ہے۔''

''مگر اب کیا کروں...... پاپا تو کوئی چیز ہی نہیں لیتے...... ارجنٹائنا والے انکل برامان کر سب چیزیں چھوڑ گئے تھے...... پاپا نے سب پڑوس

میں بانٹ دیں۔‘‘

’’میں تمھیں شرٹ کا کپڑا دوں گا۔‘‘

’’نا بابا! پاپا نہیں لینے دیں گے......‘‘ فہیم نے عجیب سے انداز میں ہاتھ ہلا کر کہا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو، میرے لئے قیامت آجائے گی۔ حالانکہ اس کے دل میں یہ بات ضرور آئی تھی کہ کپڑا تو تم دے دو گے مگر شرٹ کیسے سلے گی۔‘‘

’’تمہاری مرضی۔‘‘ امجد آہستہ سے بولا۔’’میں نے تو اس لیے کہا تھا کہ تم میرے دوست ہی نہیں، بھائی ہو...... اور وہ کپڑا میرے پاس یوں ہی رکھا ہے۔‘‘

فہیم خاموش ہو گیا تھا۔ اب اس کا دل بولنے کو چاہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ امجد کو کیا بتائے...... کیا اسے یہ بتا دے کہ کپڑا لے کر بھی وہ اسے سلوا نہیں سکے گا۔

ظاہر ہے یہ بات وہ امجد کو نہیں بتا سکتا تھا۔

جبکہ وہ ہر روز امجد کے سامنے خود کو اس کے برابر کا ظاہر کرتا تھا اور یہی کوشش کرتا تھا کہ اس کا بھرم بنا رہے۔

اور بظاہر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ لیکن اس

کے لیے اسے بڑی پریشانیاں اُٹھانی پڑی تھیں۔

لیکن کل جب وہ امجد کے گھر گیا، اور امجد کی امی نے اس سے کہا کہ وہ کسی دن اپنی والدہ کو ہمارے یہاں لائے ...... تو وہ بے حد پریشان ہوا۔ اس کی امی بڑی سیدھی سادی عورت تھیں اور وہ بھی غریب گھرانے کی۔ جن کے پاس دو تین ساڑھیوں کے علاوہ ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں تھے پاپا کی اتنی آمدنی ہی نہیں تھی کہ وہ نئے نئے کپڑے اور زیور بنوا سکیں۔ اور وہ دیکھ چکا تھا، امجد کے گھر کی ملازمہ بھی ان سے اچھے کپڑے پہنے تھی۔ امجد کی امی نے نہ صرف بہت قیمتی کپڑے پہنے تھے بلکہ سونے اور موتیوں کے کئی زیور پہن رکھے تھے۔

ظاہر ہے اس کا ڈرنا فطری تھا کہ اب جب امی اپنے انھیں الٹے سیدھے کپڑوں کے ساتھ ان کے گھر جائیں گی تو ان کی کیا خاک عزت ہوگی ...... ہوسکتا ہے وہ انھیں اپنی نوکرانی ہی کی طرح کم درجے کی سمجھ کر اپنے برابر بیٹھانا بھی گوارہ نہ کریں۔

پہلے تو وہ سوچتا رہا۔ امی جانے سے انکار کردیں، یا وہ امی کی مصروفیت کی بہانہ بنادے۔ لیکن پھر اس نے امی سے کہہ دیا۔

مگر اب جب امی چل ہی پڑیں تو اس کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ

سوچتا رہا کہ اب وہ کیا منھ لے کر امجد کا سامنا کرے گا۔ امجد اس پر ہنسے گا۔ اس کے گھر کے لوگ اس کی امی کی بے عزتی کریں گے۔

وہ امجد کے گھر پہنچتے پہنچتے ٹھٹک گیا۔ امی اندر جا چکی تھیں ۔ وہ باہر خواہ مخواہ کھڑا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ نہ جانے امی کو امجد کی ماں نے اپنے قریب بیٹھنے بھی دیا ہو یا نہیں۔

جب ہی سامنے سے امجد آ گیا......اور اس نے آتے ہی اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ''آنٹی آئی ہیں۔''

''ہاں آئی تو ہیں......'' فہیم مردہ دلی سے بولا۔

''تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''یوں ہی کھڑا تھا۔''

''آؤ، چلو......'' اور اندر آ کر اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے لیے حیرت ناک تھا۔

صاف ستھرا بستر لگی مسہری پر امی اور امجد کی والدہ بہت قریب بیٹھی بڑے مزے میں باتیں کر رہی تھیں، بالکل ایسے ہی جیسے ان دونوں میں برسوں کی پہچان ہو......اور ملازمہ اُن کے سامنے ناشتے کا سامان چن رہی تھی۔●● (نور-رامپور)

باجی نے منو کو بھیج تو دیا مگر دل اس کی طرف پڑا رہا، حالانکہ چلتے وقت اس کو خوب سمجھا دیا تھا۔

''دیکھ سنبھل کر جانا۔ ڈرنا نہیں۔ اچھا! سمجھ گئے نا؟ ٹھیک منڈی چوک سے داہنی طرف مڑ جانا۔''

''پھر بائیں طرف گلی میں'' منّو نے زینہ اترتے زرا دھیمی آواز میں کہا۔

''ہاں۔ ہاں! شاباش! کتنا اچھا ہے بھیا! گلی میں سامنے ہی نیلے

کواڑوں کا دروازہ ہے بس وہی شمیم کا گھر ہے، اندر جا کر سب کو سلام کرنا اچھا!"
باجی اترتے اترتے بھی اس کو دوبارہ ہدایت کرنے لگیں۔ "بس جاؤ۔ پھر امی کے ساتھ واپس آجانا۔ اچھا"

مگر باجی تھیں کہ بری طرح پریشان۔ پھر بھی انھوں نے منو کی طرف سے دھیان ہٹا کر دل کام کاج میں لگانا چاہا۔ لیکن سویٹر بنتے ان کا خیال پھر منو کی طرف چلا گیا۔

"پان دریبہ سے تو خیر وہ نکل گیا ہوگا۔ وہاں تک وہ چلا جاتا ہے مگر منڈی چوک میں تو کافی بھیڑ رہتی ہے کارخانوں کے برتنوں سے لدے ٹھیلے اور گاڑیاں ہر دم گزرتی رہتی ہیں ایک لمبی لائن لگ جاتی ہے، گھنٹوں کھڑے رہنے پر بھی سڑک پار نہیں کی جا سکتی۔"

باجی نے پھر اپنے خیالات کو جھٹک دیا۔ مگر دل نہیں مانا۔

"اب وہ ایسا بچہ بھی تو نہیں ہے اتنے بڑے بچے تو کان کترتے ہیں ، اور پھر ابھی سے عادت نہیں پڑے گی تو سڑک پر چلنا تک نہیں آئے گا۔ اپنی پرچھائی تک سے تو ڈر لگتا ہے اُسے: یہ سب امی کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہے نا" باجی جانے کیا کیا سوچتی رہیں۔

دراصل امی نے اور بابو جی نے منو کو بالکل ڈرپوک بنا دیا تھا۔ امی تو

خیر اس کو کبھی کبھی باہر جانے بھی دیتیں لیکن بابو جی ہر دم "یوں نہیں یوں" کرتے رہتے۔ منو جب پانچ سال کا تھا تب ہی اس کو اِمروز مونٹیسری اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ فیض گنج کی گلی پار کر کے سیدھا راستہ تھا۔ گلی کے دوسرے بچے تنہا اپنا بیگ اچھالتے چلے جاتے مگر بابو جی نے منو کے لئے شبراتی کو رکھ لیا تھا۔ گلی کے موڑ پر مرزا جی کی دودھ کی دوکان ہے وہاں سے کبھی دہی تو منگایا نہیں جا سکتا تھا اس سے جب وہ کھیلنے نیچے گارڈ صاحب کے بچوں کے پاس جاتا تو امی کو کئی بار جھانک کر دیکھنا پڑتا۔ کبھی کبھی تو وہ نیچے جا کر دیکھ بھی آتیں۔

گھر میں صرف دو آدمی تھے جو چاہتے تھے کہ منو کے اندر کا یہ ڈر دور ہو اور اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو۔ بھائی جان تو خیر شام کو ہی دفتر سے آتے یا پھر کسی چھٹی کے دن گھر پر رہتے ہیں! باجی ہر دم اس کوشش میں رہتیں۔ باوجود امی اور بابو جی کے ڈر کے وہ منو کو اپنے ساتھ لے جاتیں اور چوک کی بھری پُری سڑک پر چھوڑ دیتیں اور اس کو بتاتیں کہ سڑک کس طرح پار کی جاتی ہے یہ دوسری بات ہے کہ جیسے ہی وہ سڑک پر چلتا باجی کی سانس رکنے لگتی اور وہ خود بھی اس کے ساتھ ہو جاتیں۔

لیکن آج نہ جانے کیوں وہ خود کو مجرم تصور کرنے لگیں ان کے

ساتھ منو ایک دو بار شمیم کے گھر ہو آیا تھا پھر بھی باجی کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ دل بہلانے کے لئے نیچے گارڈ صاحب کی لڑکی عصمت کے پاس آ گئیں۔

''کیوں رضیہ! آج کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو'' عصمت نے معلوم کیا۔

''کیا بتاؤں! آج منو گھر پر نہیں ہے'' باجی بولیں

''ارے! گھومنے نکل گیا کہیں؟''

''نہیں گھومنے تو وہ کیا جاتا۔'' باجی بتانے لگیں۔ ''صبح امی شمیم کے یہاں گئی تھیں وہ یہاں پریشان رہا بار بار جانے کے لئے کہتا۔ میں نے سوچا بہل جائے گا۔ اب دیکھو تو کوئی تھا نہیں، کس کے ساتھ بھیجتی اکیلا ہی بھیجنا پڑا'' باجی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگیں ''اور بھئی سچ تو یہ ہے کہ امی اور بابو جی نے اس کو اتنا ڈرپوک بنا دیا ہے کہ کہیں اکیلا جا ہی نہیں سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ آخر کب تک ایسا ہی رہے گا'' شاہدی صاحب کے بچے کتنے چھوٹے ہیں، دنیا کا کام کر لاتے ہیں۔''

''لیکن چچا جان کو معلوم ہو گا تو......؟'' عصمت اچانک بات کاٹ کر بولی۔

''اوں...... ہاں'' بابو جی کا خیال آتے ہی باجی پھر پریشان ہو گئیں۔

مگر پھر بولیں ''ارے بھئی کب تک ان کا خیال رکھا جائے ۔ جب تک بابو جی آئیں گے تب تک تو وہ امی کے ساتھ واپس آجائے گا۔''

اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے وہ اسی طرح کی باتیں عصمت سے کرتی رہیں ۔کبھی دل ہی دل میں مطمئن ہو جاتیں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔لیکن پھر دل پریشان ہونے لگتا اور وہ یاد کرنے لگتیں کہ کوئی ہدایت دینے سے تو نہیں رہ گئی تھی۔

آدھے گھنٹے عصمت کے پاس رہنے کے بعد باجی پھر اوپر آگئیں۔ اور ایک کتاب لے کر بیٹھ گئیں ۔ورق گردانی کرتی رہیں پھر کتاب شیلف میں رکھ دی اور اٹھ کر گلی میں کھلنے والی کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئیں۔گلی دور تک سنسان تھی۔کوئی آجا نہیں رہا تھا۔

بھائی جان ہمیشہ بابو جی سے پہلے آیا کرتے تھے آج اتفاقاً انہیں بھی دیر ہوگئی تھی۔

''خدا جانے آج کیا ہونے والا ہے'' باجی نے گھڑی دیکھی۔

'' بابو جی اگر پہلے آگئے تو بس مصیبت آجائے گی امی کا تو کچھ بھی نہیں ہے وہ صرف دبی زبان سے ڈانٹ ہی تو دیں گی مگر بابو جی وہ خبر لیں گے کہ خدا کی پناہ'' باجی پھر سوچنے لگیں۔''اور یہ آج امی کو کیا ہوگیا ہے انہیں

بابو جی کے آنے کا بھی خیال نہیں۔ وہ تو اتنی دیر کہیں رکتی ہی نہیں ہیں......
کوئی اور بھی تو ایسا نہیں۔ بھائی جان ہی آ جاتے۔" باجی کے دل میں طرح
طرح کے خیالات کا تانتا بندھ گیا۔

"لاؤ ایک بار اور نیچے دیکھوں۔ شاید کوئی ادھر جانے والا ہو......"
باجی نے کھڑکی میں سے گلی میں جھانکا۔ اس بار گلی کے دوسرے سرے پر
بھائی جان آتے دکھائی دے گئے۔ باجی کے دم میں دم آیا۔ بھائی جان اپنے
مخصوص انداز میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلنے کے انداز میں چلے
آ رہے تھے۔

باجی بھاگ کر زینے کی آخری سیڑھی پر آ گئیں مگر انھیں خیال آیا اگر
بھائی جان بھی غصہ ہونے لگے تو؟ باجی رک گئیں، لیکن پھر انہوں نے دل کو
مضبوط کیا۔" کہہ دوں گی ناراض ہونے کا وقت نہیں ہے بھائی جان!......
بس جلدی سے منو کو دیکھ آیئے۔"

اور جیسے ہی بھائی جان نے زینے پر قدم رکھا وہ بولیں۔" بھائی
جان وہ منو......"

"کیا ہوا منو کو............" بھائی جان کا چہرہ فق ہو گیا۔

"امی شمیم کے یہاں گئی ہیں، وہ یہاں پریشان تھا میں نے اکیلا

ہی بھیج دیا۔“

”ارے! اچھا پریشان تو نہ ہو۔ کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ! میں دیکھتا ہوں اسے“ اور بھائی جان الٹے پیر لوٹ گئے۔

باجی کا دل بھر آیا۔ شاید انہیں اتنا افسوس نہ ہوتا اگر بھائی جان نے بجائے خاموشی سے واپس چلے جانے کے ان کو تو...... ڈانٹا ہوتا۔ پھر وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگیں۔

”یا اللہ ہمارا منومل جائے۔ وہ امی کے پاس خیریت سے پہنچ گیا ہو، ہم نے اب تک کسی کا برا نہیں چاہا یا خدا ہم لوگوں پر رحم کر۔“

اور پھر وہ زینے کے دروازے سے سر ٹکائے کھڑی بھائی جان کا انتظار کرنے لگیں۔

گلی میں قدموں کی آہٹ ہوئی۔ دو تین سیڑھیاں اتر گئیں۔ بھائی جان منو کا ہاتھ تھامے زینے کے نیچے نظر باجی دو سیڑھیاں پھر اتر گئیں۔ اور بڑھ کر منو کو بے اختیار گلے لگا لیا

”کہاں.......... شمیم کے یہاں تھا؟ ارے بھیا رو کیوں رہا ہے امی نہیں آئیں۔ انہیں کے پاس تھا نا؟“ باجی نے سوال کی بوچھار کر دی۔

”تھا تمہارا سر امی کے پاس..........“ بھائی جان جھلا کر بولے

''در پیے پان تک تو گیا نہیں ۔ واپس آ کر زاہد کے پھاٹک میں روئے جا رہے تھے حضرت ......'' ●●

(کھلونا۔نئی دہلی)

سچی کہانی

جب کوثر پہلے پہلے ہمارے گھر آئی تو دروازے میں ٹھٹھک کر رہ گئی میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ رضیہ، امی کے پاس بیٹھی تھی ۔ منو اور چمن ، شمو کے ساتھ کھیل رہے تھے ۔ کوثر نے ایک بار اندر جھانک کر دیکھا۔ پردے کی سرسراہٹ پر میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

میں پھر لکھنے لگا۔

اس نے پھر جھانکا۔

رضیہ اب بھی امی کے پاس بیٹھی تھی ۔ منو اور چمن آپس میں لڑ رہے
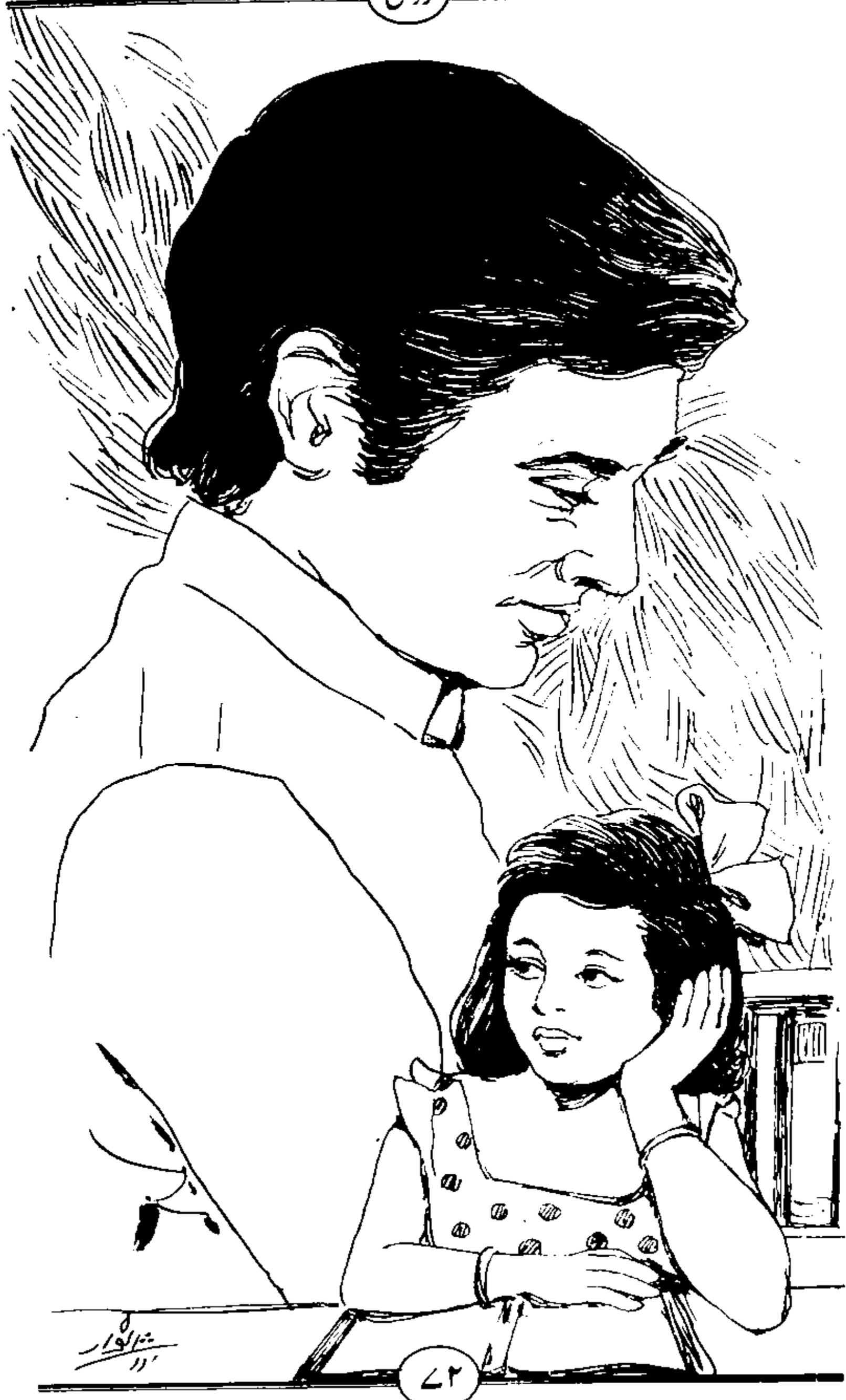
تھے۔اور شمّو کھڑی منہ بسور رہی تھی۔

پردہ پھر ہلا۔میں نے لکھتے لکھتے پھر نگاہ اُٹھائی۔کوثر پھر ہٹ گئی۔

اس بار میں تیزی سے اُٹھ کر پردے کی آڑ میں جا کر کھڑا ہو گیا، اس بار جونہی اس نے اندر جھانکا۔میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

''رضیہ......'' کوثر کے منھ سے چیخ نکل گئی۔

''ارے کوثر تم......'' رضیہ اٹھ کر آئی۔کوثر اجنبیوں کی طرح جھینپی جھینپی کھڑی تھی۔

''ہوں۔تو تم رضیہ کے پاس آئی ہو...... چوروں کی طرح کیوں جھانک رہی تھیں؟'' میں نے اس سے کہا اور اس نے جھینپ کر رضیہ کی پیٹھ کے پیچھے منھ چھپالیا۔

اس طرح وہ پہلے روز ہمارے یہاں آئی۔

وہ رضیہ کے ساتھ پڑھتی تھی۔پھر وہ ہر روز گھر آنے لگی، اور پھر گھر کے دوسرے بچوں کی طرح حرکتیں بھی کرنے لگی۔

بھائی صاحب! یہ قلم مجھے دے دیجئے نا......؟ اور یہ پھول جو واز میں لگا ہے مجھے بہت پسند ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایک روز جو وہ آئی تو سیدھی میرے پاس چلی آئی۔

''بھائی صاحب! آپ نے برتن بنانے کا کارخانہ دیکھا ہے؟''

اس نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں! اپنے زاہد خالو کا جو کارخانہ ہے۔''

''تو پھر آپ نے ان کارخانوں کے منشی بھی ضرور دیکھے ہوں گے۔؟''

''ارے ہاں بھئی! یہ اپنے برابر میں منشی مجیب صاحب کیا رہتے ہیں۔''

'بس تو پھر میری بات مانئے اور یہ کہانیاں وہانیاں لکھنی چھوڑ کر کسی کارخانے کی منشی گیری شروع کر دیجیے۔''

میں نے اسے گھورا۔

''آپ کی کتنی ہی کہانیاں پڑھی ہیں، سب ایک ہی جیسی ہیں، کسی میں شرارتیں کسی میں حلوے کی چوری، کسی میں بھائی بہن کی لڑائی ...... آخر آپ لکھتے کیا ہیں؟''

''کوثر......'' میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹا۔

''نہیں، نہیں، بھائی صاحب ایک بات۔'' کوثر نے کچھ اس انداز سے کہا کہ باوجود غصے کے ہنسی آ گئی۔

''دیکھیے نا۔ کہانیوں سے تو ہمیں تعلیم ملتی ہے۔ ہمارے کورس کی

کتابوں میں بھی کتنی ہی کہانیاں ہیں۔ کسی سے سبق ملتا ہے ''چوری مت کرو'' کسی سے ہم سیکھتے ہیں ''دوسروں کو مت ستاؤ۔'' مگر آپ ہیں کہ چوری کی ترغیب دیتے ہیں۔ شرارتوں کی ترکیب بتاتے ہیں۔ میرے اچھے بھائی صاحب! ایسی کہانیاں مت لکھئے۔ آپ تو بہت اچھا لکھتے ہیں۔ کتنے ڈھیر سارے خط آتے ہیں آپ کی کہانیوں کی تعریف میں، بڑے بڑے رسالوں میں آپ کی کہانیاں چھپتی ہیں۔ مگر آپ کی بچوں کی کوئی بھی کہانی ایسی ہے جس پر کسی نے آپ کو خط لکھا ہو۔! آخر ہم بچوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ اُلٹی سیدھی کہانیاں ہمارے لئے لکھتے ہیں۔''

میں کوثر کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ بولے چلی جارہی تھی۔ گیارہ بارہ برس کی آٹھویں جماعت میں پڑھنے والی لڑکی کس قدر تیز اور کسی لیڈر کی طرح تقریر کئے جارہی تھی۔

''کوثر!'' میں نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''پگلی! آج کل کے بچے بھی تو ایسی ہی کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ ورنہ پھر ان رسالوں کے مدیران کو کیا پڑی ہے کہ وہ یہ کہانیاں شائع کریں۔''

''بھائی صاحب! ان ایڈیٹروں کی بھی ایک ہی کہی۔ دینا دلانا تو کچھ ہوتا نہیں ایک دو کہانیاں یوں ہی بھرتی کی چھاپ دیں۔ اس سے ان

حضرات کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔'' وہ بولی۔

''اچھا بڑی بی ! آپ کی نصیحت سر آنکھوں پر ، اب ایسی ہی کہانیاں لکھوں گا۔ جن کو پڑھ کر بچے اچھی باتیں سیکھ سکیں اب تو خوش۔''

''ویسے آپ کہانیاں بہت اچھی لکھتے ہیں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''خوشامدی کہیں کی، لو چلو بھاگو۔'' میں نے ایک رسالہ اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا اور وہ رضیہ کے پاس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ انتہائی ذہین بچی ہے۔ کتنی سمجھداری کی باتیں کرتی ہے۔ ضرور اپنے درجے میں اوّل آتی ہوگی اور پھر میں نے طے کرلیا کہ اب بچوں کے لئے جو بھی کہانی لکھوں گا وہ سبق آموز ہوگی۔ صرف تفریح ہی تو مقصد نہیں ہے۔

اچانک کوثر کئی دن ہمارے یہاں نہیں آئی۔ مصروفیت کے سبب میں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ آج خیال آیا تو میں نے رضیہ سے معلوم کیا۔

''ارے بھئی رضو! یہ تمہاری کوثر بی آج کل کہاں غائب ہیں؟''

''ارے بھائی صاحب! ایک روز رات میں اسٹول سے گر پڑی، کافی چوٹ آئی ہے اسکول میں نہیں آرہی ہے۔ آج اسے دیکھنے جاؤں گی۔''

''ارے ہمیں تو خبر ہی نہیں۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔''

شام کو رضیہ کے ساتھ میں بھی اسے دیکھنے چلا گیا۔ کوثر کی والدہ کو ہم خالہ جان کہتے ہیں۔ وہ کوثر کو دوا دے رہی تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔

''کیوں بھئی بڑی بی! تمھیں تو کافی چوٹ آئی معلوم ہوتی ہے۔'' میں نے کہا

''حرکتیں ہی ایسی کرتی ہے۔'' خالہ جان کوثر کو گھور کر بولیں۔

''جی......'' میں نے ایک بار کوثر کو اور پھر خالہ جان کو دیکھا۔

''کیا بتاؤں شوکی بیٹے! یہ لڑکی اتنی شریر ہے کہ ناک میں دم کر دیا ہے۔''

''امّی......!'' کوثر کمزور آواز میں مچل کر بولی۔

''کیا بتاؤں نہیں......؟ ارے بیٹے ہوا یہ کہ راشد کے تایا میاں نے دہلی سے سوہن حلوہ بھجوایا تھا۔ دونوں کو برابر برابر دے دیا۔ راشد میاں مچل گئے اور لگے رونے، ضد کرنے کہ ان کا حصہ کم ہے۔''

''کم تھا تو۔ آپ نے بجیا کو زیادہ دیا تھا۔'' قریب کھڑا ہوا راشد بولا۔

''تھا زیادہ تمہارا سر، کہیں اچھے بچے ایسی باتیں کرتے ہیں۔'' خالہ جان نے راشد میاں کو جھڑک دیا۔

''ہاں تو پھر یہ ہوا کہ جب یہ خوب روئے تو ہم نے کوثر سے کہا تم بڑی ہو، اپنے حصے میں سے تھوڑا انھیں اور دے دو......''

''تھوڑا سا، سب تو لے لیا تھا اوں......'' لیٹے لیٹے کوثر بولی۔

''بڑا احسان کیا تھا۔ شرم نہیں آتی۔'' خالہ نے اسے بھی جھڑک دیا۔

''جی پھر......'' میں نے مسکرا کر کوثر کی طرف دیکھا۔ خالہ جان آگے سنانے لگیں۔

''کوثر نے اپنا حلوہ کھا کر برابر کر دیا۔ راشد میاں ذرا کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ ایک ایک دانہ سنبھال کر رکھا۔ رات کو بستر پر ڈبّہ لے کر سو گئے۔ ہم نے اٹھا کر کارنس پر رکھ دیا۔ خدا جانے یہ جاگ رہی تھیں۔ ہم تو سمجھے کہ سو گئی ہیں، جب بتی وغیرہ بند کر دی تو یہ بی اٹھ کر اسٹول پر چڑھیں۔ دیکھو نا یہ کارنس بہت اونچا ہے۔ اسٹول پر کرسی رکھی۔ بس گر پڑیں۔''

''چوری کر رہی تھیں۔ ماشاءاللہ......'' میں مسکرایا۔

''اب تم ہی دیکھو۔'' خالہ جان کمرے سے ہم لوگوں کے لئے چائے بنانے چلی گئیں۔

اب تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کوثر کا کیا حال تھا۔ لاکھ کہنے پر بھی اس نے اپنا منہ چادر سے باہر نہیں نکالا۔

اوراب یہ کہانی لکھ چکنے کے بعد میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ اس کہانی سے کیا سبق لے گی حالانکہ یہ اس کی اپنی کہانی ہے اور بالکل سچی ہے۔ ●●

(ثانی۔لکھنؤ، اُمنگ۔دہلی)

بویا پیڑ ببول کا

اگر سڑک پار کرنے کے لئے فٹ پاتھ پر ایک گھنٹہ سے سڑک خالی ہونے کا انتظار کرتا ہوا کوئی اچھا بھلا نوجوان آپ کو نظر آجائے۔ اگر کسی میدان میں بچے کرکٹ کھیل رہے ہوں، ان کا امپائر ان سے بڑا کوئی نوجوان ہو جو سامنے سے پھینکی ہوئی گیند کو کیچ کر کے وکٹ سے لگا کر آؤٹ آؤٹ کا شور مچادے، یا کبھی آپ ہمارے گھر آئیں اور پاپا کو ہم میں سب سے بڑے نوجوان لڑکے کو ڈانٹتے ہوئے دیکھیں، یا پھر ہمارے ساتھ امّی کی الماری سے چرائی ہوئی مٹھائی کھاتے اور جلدی جلدی منہ صاف کرتے

آپ کو ہم میں سب سے بڑا کوئی لڑکا نظر آجائے......تو

پہچان لیجئے وہی ہمارے چچا اقبال ہیں۔

لیکن یہ ان دنوں کا ذکر ہے کہ جب چچا اقبال ہماری ہی طرح چھوٹے تھے سچ مچ کے چھوٹے (آج کل تو نہ وہ چھوٹوں میں شامل ہیں، نہ بڑوں میں) دادا جان کا انتقال ہو چکا تھا اور پاپا کو بڑوں کے تمام اختیارات مل گئے تھے تمام گھر کی ذمہ داری ان پر تھی۔سرکاری ملازم تھے۔ ایک دن یہاں سے تبادلہ ہوتا تو دوسرے دن وہاں سے پاپا جہاں جاتے گھر کے تمام لوگ بھی ساتھ جاتے۔

ایک بار پاپا کا تبادلہ ان دنوں ہوا جب چچا اقبال کے ششماہی امتحان جاری تھے نہ چچا کا امتحان رک سکتا تھا اور نہ تبادلے کا سرکاری حکم بہت سوچا کہ کیا کیا جائے، آخر یہ طے پایا کہ چچا اقبال کو چھ ماہ کے لیے ہوسٹل میں داخل کر دیا جائے وہاں رہ کر وہ اپنا یہ سال پورا کریں اور پھر گھر آئیں۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب وہ حسن پور ہائی اسکول کے ہوسٹل میں تھے۔

گھر اور ہوسٹل کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے اس لیے داخلے کے ابتدائی دنوں میں وہ کچھ گھبرائے لیکن پھر انہوں نے خود کو ہوسٹل کے ماحول

کے مطابق ڈھال لیا۔

چچا اقبال پڑھنے لکھنے میں پیچھے رہنے والوں میں سے نہیں تھے، وہ اپنا روز کا کام اسی دن مکمل کرلیا کرتے۔ دوسرے دن جب کلاس میں دوسرے لڑکے کام نہ کرنے کے سلسلے میں سزا پاتے تو وہ اپنی سیٹ پر بیٹھے مزے سے دوسرا کام کرتے رہتے۔ کچھ لڑکے ان کے ہر روز سزا سے بچ جانے سے جلنے لگے تھے۔

ان کے ساتھیوں میں ایک صاحب تھے۔ افضال الدین۔ بقول چچا کے افضال صاحب کیا تھے بس آفت کی پڑیا تھے وہ بھی ہوسٹل ہی میں رہتے تھے، روز ہوسٹل کے اصول توڑتے تھے اور سزا پاتے تھے۔ ہر روز کسی نہ کسی کی شکایت پر بنچ پر کھڑا کردیئے جاتے۔ کلاس ٹیچر نے تو ان کا کلاس میں داخلہ ہی ممنوع قرار دے رکھا تھا لیکن وہ خدا جانے کس مٹی کے بنے تھے کہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتے بلکہ شرارتوں میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔

ایک بار چچا اقبال نے ان کے حق میں جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا تو وہ چچا سے بری طرح جلنے لگے۔ کچھ لڑکے تو پہلے ہی ان سے حسد رکھتے تھے اب سب کے سردار بن گئے ...... افضال ......! کل ملا کر آٹھ

لڑکوں کی یہ ٹولی تھی جو ہر طرح چچا اقبال کو پریشان کرنے اور ستانے کی کوشش کرتی۔

ہوسٹل کے وارڈن صاحب بڑے بااصول آدمی تھے (جیسا کے عموماً سب وارڈن ہوتے ہیں) انھوں نے ایک اصول یہ بنایا تھا کہ کوئی لڑکا رات کو گیارہ بجے کے بعد نہیں پڑھے گا۔ گیارہ بجے کے بعد جس کے کمرے میں روشنی دیکھی جائے گی اسے سزا دی جائے گی ۔ جرمانہ ہوتا تب بھی برداشت کرلیا جاتا۔ لیکن وہاں سزا ملتی تھی۔ اور سزا بھی کیسی؟ صبح کو اسکول شروع ہونے سے چھٹی ہونے تک لان میں کھڑا رہنا پڑتا (سب کو معلوم ہوجاتا کہ یہ لڑکا بہت پڑھنے والا ہے...... عجیب سزا تھی) وارڈن صاحب نے چوکیدار کو حکم دے دیا تھا کہ وہ گیارہ کا گھنٹہ بجتے ہی پورے ہوسٹل میں جس کمرے میں روشنی دیکھے اس کا نام لکھ کر دے۔

چوکیدار بھی ایک ہی تھا۔ نہ جانے کب چور کی طرح دبے پاؤں آتا اور نام لکھ کر لے جاتا۔ وہ تو معلوم ہی اس وقت ہوتا جب صبح کو لان میں کھڑا ہونا پڑتا۔

ایک دن چچا اقبال صبح ہی سے سر میں درد محسوس کر رہے تھے سہ پہر تک تو درد اور بھی بڑھ گیا اُدھر سر سے اونچا ہوم ورک، مرتے کیا نہ کرتے

پڑھنے بیٹھے تو سر کا درد اور بھی بڑھ گیا۔ دو چار گولیاں بھی کھائیں مگر درد قرض خواہ کی طرح چمٹا ہوا تھا، کتابوں کو سمیٹا اور لیٹ گئے نہ جانے کب نیند آ گئی۔ وہ سوتے رہے اور جب اچانک آنکھ کھل گئی تو ہڑبڑا کر اُٹھے۔ گھڑی دیکھی تو دس بج چکے تھے۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اب وہ ایک گھنٹہ میں کیا کر سکتے تھے ہسٹری کے نوٹ تیار کریں یا ریاضی میں سر کھپائیں انگریزی میں الگ عنوان پر مضمون بھی تیار کرنا تھا۔

''اگر گیارہ بجے تک یہ سب کام پورا نہ ہوا تو سزا ملے گی اور گیارہ بجے کے بعد تک پڑھتے رہنے سے بھی سزا ملے گی۔'' وہ سوچنے لگے

''دیکھا جائے گا۔ ہوم ورک تو مکمل ہو جائے گا'' انھوں نے سوچا اور ہمت کر کے بیٹھ گئے ہوم ورک کرنے۔

ایک بج گیا۔

انگریزی مضمون کی آخری لائنیں لکھ رہے تھے کہ اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چچا کے ہاتھ سے قلم گر گیا۔ جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا سامنے افضال کھڑے تھے۔ بہت پریشان پریشان!

''کیا بات ہے''؟ چچا نے حیران ہو کر معلوم کیا۔

''بات کیا ہوتی۔'' افضال نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا'' وہ

عبدل کا بچہ میرا اور تمہارا نام لکھ کر لے گیا ہے۔ میں نے تو بڑی خوشامد کر کے اپنا نام کٹوالیا...... مگر......!

''مگر کیا......؟ چچا کو تشویش ہوئی۔

''یہی کہ اب تمہیں لان میں کھڑا ہونا پڑے گا۔''

چچا نے پوری بات بھی نہیں سنی اور عبدل چوکیدار کی کوٹھری کی طرف بھاگے اس کا خیال تھا کہ پہلی غلطی ہے خوشامد سے کام چل جائے گا وہ کوٹھری کے سامنے پہنچے تو دروازے پر بڑے سے علی گڑھی تالے نے ان کا منہ چڑا دیا۔

''دھت ترے کی...... چچا بڑبڑائے، جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔

عبدل تو شام ہی دو دن کی چھٹی پر چلا گیا تھا چچا جھلا کر رہ گئے۔ یہ افضال کے ہاتھوں ان کی پہلی ہار تھی۔

ایک دن چچا اقبال بڑے میٹھے میٹھے خواب دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنی کلاس میں امتیازی نمبروں سے پاس ہو گئے ہیں ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کے گلے میں سُرخ سُرخ گلاب کے پھولوں کا ہار ڈال دیا ہے اور وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ کہ اچانک ان کے گلے سے وہ ہار کسی نے نوچ لیا۔

گھبرا کران کی آنکھ کھل گئی۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی وہ آنکھ ملتے اُٹھے

''کون''؟

باہر سے کوئی آواز نہیں آئی تو اُٹھ کر کواڑ کھولے، باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ جھلا کر کواڑ بند کر لئے اور بستر پر آ کر لیٹ گئے۔ کنڈی پھر کھٹکی چچا نے اُٹھ کر کواڑ کھولے باہر سناٹا تھا۔ ابھی کواڑ بند کر کے پلٹے ہی تھے کہ کنڈی پھر کھٹکی چچا نے جھلا کر کواڑ کھول دیئے اور پھر اپنا سر پکڑ کر رہ گئے کنڈی میں ایک دھاگہ بندھا ہوا تھا اور کوئی دور سے اسے کھینچ کر کنڈی کھٹ کھٹا دیتا تھا۔

ظاہر ہے یہ افضال ہوں گے

ایک دن خوب زوردار بارش ہوئی بڑی بڑی عمارتیں ٹپکنے لگیں۔ وارڈن صاحب کا کمرہ بھی یوں ٹپکا جیسے اوپر چھت ہی نہ ہو اس پر شامت یہ آئی کہ وارڈن صاحب کے ایک عزیز بھی تشریف لے آئے۔ دوسرے کمروں میں پہلے ہی دو دو تین تین لڑکے رہتے تھے اتفاق سے چچا اقبال اپنے کمرے میں تنہا رہا کرتے تھے وارڈن صاحب نے انہیں کے کمرے میں اپنے عزیز اکرام صاحب کا بستر لگوا دیا۔

اکرام صاحب سفر کے تھکے ہوئے تھے بستر پر لیٹتے ہی سو گئے۔

اچانک کسی وقت اکرام صاحب ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ ان کا بستر کھڑکی کے پاس ہی لگا ہوا تھا انہیں اپنا بستر بھیگا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سمجھے شاید کھڑکی سے بارش کی پھوار آئی ہوگی۔ اور بستر بھیگ گیا ہوگا ہاتھ بڑھا کر انھوں نے کھڑکی بند کردی اور بستر کا رخ پلٹ کر لیٹ گئے۔

اتنے میں باہر سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی۔

''پوری بالٹی ہی ڈال دو۔'' اس بار کسی نے کہا۔

''پہلے دیکھ تو لو۔ ہوسکتا ہے اب بستر چھوڑ کر زمین پر ہی سو رہا ہو۔''

اکرام صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔ پہلے انھوں نے سوچا کہ چچا اقبال کو جگائیں پھر انہیں بھی تفریح سوجھی وہ آہستہ سے بستر سے اُتر کر کھڑکی کے پاس آئے اور ان لوگوں کی باتیں سننے لگے۔ پھر آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولی۔ مگر ٹھٹھک گئے۔

''پہلے دروازہ کھٹ کھٹاؤ۔ جیسے ہی دروازہ کھلے بالٹی الٹ دو۔'' باہر سے آوازیں برابر آرہی تھیں۔''

''دروازہ کھٹ کھٹانے سے اب کچھ نہیں ہوگا۔ وہ سمجھ جائے گا کتنی بار تو ایسا ہوا ہے۔''

''پھر۔؟ اب تو کھڑکی بھی بند کرلی۔''

''روشن دان......'' کسی نے روشن دان کی بجھائی۔

اکرام صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اکرام صاحب نے کنڈی کھلی چھوڑ دی اور اس سے پہلے کہ کوئی روشن دان سے جھانکے وہ روشن دان کے نیچے پڑی کرسی پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے۔

آہستہ آہستہ دو ہاتھ روشن دان کے کنارے پر ابھرے اور جب ہی اکرام صاحب نے ان ہاتھوں کو پکڑ لیا۔

باہر ایک چیخ ابھری

''کیا ہوا......کوئی بولا

''جان سے مار ڈالوں گا۔'' اکرام صاحب نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ ان کا لہجہ بہت خوفناک تھا'' جیسا میں کہوں ویسا ہی کہو''

''آپ......آپ......کون......کون ہیں......؟''

''بھوت......'' اکرام صاحب نے خوفناک لہجے میں کہا۔

''کچھ بتا بھی......تو تو لٹک کر رہ گیا۔'' نیچے سے پھر کسی نے کہا۔

''کہہ دو دروازہ کھلا ہے اندر آ جاؤ۔'' اکرام صاحب پھر غرائے مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ بے چارا تو لٹکا ہوا تھا اس نے کہہ دیا۔

چار پانچ لڑکے اندر آ گئے۔

"باہر سے کواڑ بند کرلو اور چپ چاپ وارڈن صاحب کو بلا کر لاؤ۔ اسی میں تمہاری خیر ہے۔" اکرام صاحب نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

اندر والے لڑکے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے دیکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ کہ دروازہ بند ہوگیا۔

"ارے......؟ بے اختیار وہ سب اچھلے اسی وقت روشنی ہوگئی۔

"آ......آ......آپ ......" ان لوگوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اکرام صاحب کو دیکھا۔

اتنے میں وہ لڑکا وارڈن صاحب کو لے کر آ گیا۔اور دوسرے لمحے چچا اقبال بھی اپنے بستر سے بڑے اطمینان سے اُٹھ گئے۔ جیسے وہ پہلے ہی سے اس موقع کے منتظر رہے ہوں۔

"بھائی افضال! تم نے کتنی شرارتیں کیں۔ میں نے تم سے کبھی شکایت نہ کی۔ نہ کبھی بدلہ لینے کا خیال آیا اور آج بھی سب کچھ میرے جاگتے ہی میں ہوتا رہا۔ کیا بتاؤں بہت چاہا کہ اکرام صاحب کو تمہاری شرارتوں سے آگاہ کردوں......مگر بس......تمہارا مقدر! اور چچا اقبال نے دوبارہ چادر تان لی۔

دوسرے دن جو ہونا تھا وہی ہوا۔

افضال صاحب کو ہمیشہ کے لئے اسکول اور ہوسٹل سے چھٹی مل گئی ان کے دوسرے ساتھیوں کو سزا کے بعد معاف کردیا گیا ان لوگوں نے اپنی غلطی تسلیم کرلی تھی۔

پچا اقبال ان دنوں ایم اے کررہے ہیں۔ ان کے وہ ساتھی بھی ان کے ساتھ ہیں جنھوں نے اپنی غلطی تسلیم کرکے معافی مانگ لی تھی۔

اور افضال صاحب؟

وہ ان دنوں حسن پور کے پسر ہٹہ بازار میں ٹھیک گھاس منڈی کے موڑ پر پان بیڑی سگریٹ کی دکان لئے دن بھر پان بناتے رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق لوگوں کو الو بنانے کے لئے کبھی کبھی پان میں چونا تیز کردیتے ہیں۔

●●

(کھلونا - دہلی، نور - رامپور)

ٹکراؤ

نئے گھر کی ہر چیز نئی تھی۔

اس نئے گھر میں ایک خوب صورت لان بھی تھا۔

ایک روز نئے گھر کا یہ خوب صورت لان ہی جھگڑے کی جڑ بن گیا۔

ہوا یہ کہ پاپا نے لان کی دو کیاریوں میں غازی پوری گلاب کے پودے لگائے تھے۔ دونوں کیاریاں برابر برابر تھیں...... دونوں کیاریوں کو تقسیم کرتی ہوئی بس ایک منڈیری تھی جس پر گھاس اُگی ہوئی تھی......

دائیں طرف کی کیاری کو پاپا مُنّی کی کیاری کہا کرتے تھے اور بائیں

طرف کی کیاری کو شمّی کی۔

صبح اٹھ کر جب جمّی لان میں چہل قدمی کے لئے آتا تو اپنی کیاری کی دیکھ بھال بھی کرتا۔ وہ پودوں کو پانی دیتا اور کیاری کی صفائی کرتا۔ شمّی بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح خوب دل لگا کر اپنی کیاری کی دیکھ بھال کرتا۔

شام کو بھی دونوں اپنی اپنی کیاری کی دیکھ بھال کرنا نہیں بھولتے تھے۔

دونوں کیاریوں کے پودے خوب ہرے بھرے اور بڑے بڑے ہو گئے۔ پھر کلیاں نظر آنے لگیں۔ اور پھر ایک روز دونوں کیاریوں کے پودوں پر بہار آ گئی۔ خوب ڈھیر سارے پھول کھل گئے، گلاب کے کٹورے جیسے پھول۔ سارا لان گلاب کی خوشبو سے مہک گیا۔

پاپا اور ممی نے دونوں کو خوب شاباشی دی۔

جمّی اور شمّی پھولے نہ سمائے۔

مگر یہ کیا؟

ایک دن جمّی جب اپنی کیاری کی صفائی کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ گلاب کے گلابی پھولوں کے جھرمٹ میں سے ایک اودے رنگ کا بہت ہی خوب صورت پھول جھانک رہا تھا۔

"بھئی واہ! اودے رنگ کا گلاب بھی ہوتا ہے!" جمّی نے دل میں

سوچا اور وہ اس پھول کی طرف بڑھا۔ اس نے قریب سے دیکھا۔ یہ گلاب کا پھول نہیں تھا۔ کسی اور ہی نسل کا پھول تھا۔

چل کر پاپا سے معلوم کیا جائے کہ یہ کس نسل کا پھول ہے؟ اس نے سوچا اور کیاری سے نکل کر اندر گھر میں چلا گیا۔

اس وقت شمّی لان میں آ گیا۔ اس کی کیاری صاف تھی اور اس کو آج جاگنے میں کچھ دیر بھی ہو گئی تھی۔ اس لئے اس نے سوچا جلدی سے پودوں میں پانی ڈال دوں تا کہ وقت پر اسکول بھی جایا جا سکے۔ اس نے پانی ڈالنے کا فوارہ اٹھایا۔ پانی ڈالتے ڈالتے اس کی نظر بھی اودے رنگ کے اس پھول پڑی۔

''ارے!'' وہ پانی ڈالنا روک کر اس پھول کو دیکھنے لگا'' یہ پھول کہاں سے آ گیا؟''

اس نے جھک کر دیکھا تو دونوں کیاریوں کو تقسیم کرنے والی منڈیر پر ایک پودا کھڑا تھا۔

''کل صبح کو اس پودے کو یہاں سے نکال کر اپنی کیاری کے بیچ میں لگاؤں گا۔'' شمّی نے دل میں سوچا۔ ''گلابی پھولوں کے درمیان یہ اودے رنگ کا پھول بڑا خوب صورت لگے گا۔''

شمّی کیاری میں پانی ڈال کر کچھ دیر کے بعد اسکول چلا گیا۔ سات بجے اسکول پہنچنا تھا۔

جمّی کا اسکول دس بجے سے شروع ہوتا تھا۔ ابھی اس کے جانے میں کافی دیر تھی۔ جب وہ پاپا کو اس پھول کے بارے میں بتانے گیا تو پاپا غسل کے لئے غسل خانے میں جا چکے تھے۔ وہ لوٹ کر پھر لان میں آ گیا۔

''یہ پھول تو گلاب کے پھولوں سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔'' جمّی اودے رنگ کے اس پھول کو تکتا رہا۔ کیوں نہ اسے اٹھا کر اپنی کیاری میں لگا دوں۔''

اس خیال کے آتے ہی جمّی نے کھرپی سے پودے کی جڑ کی آس پاس کی مٹی کھودی تا کہ جڑ کٹ نہ جائے اور دوبارہ لگانے پر وہ پھول مرجھا نہ جائے۔ پھر اس نے اپنی کیاری میں ایک مناسب جگہ پر گڑھا کھود کر پودا لگا دیا ''یہ پھول تو سچ مچ میری کیاری کی رونق بن گیا۔'' جمّی پودا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ پھر وہ اندر آ گیا، اس نے غسل کیا پھر ناشتہ کیا اور اسکول چلا گیا۔

شام کو ہاکی کا میچ تھا اور جمّی کو وہ میچ دیکھنے جانا تھا۔ شمّی کو ہاکی کے کھیل سے کوئی دل چسپی نہیں تھی، اس لئے وہ سیدھا لان پر آ گیا۔

یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ وہ اودے رنگ کا پھول جمّی بھیا کا کیاری میں نظر آ رہا تھا۔

"یہ بھی خوب رہی!" شمّی بھنا گیا۔ "دیکھا میں نے اور لے اڑے بھیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" شمّی نے کھرپی سنبھالی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ پودا اس کی کیاری میں لگ گیا۔

صبح کو جمّی جب لان پر آیا تو اسے اپنی کیاری میں اُودے رنگ کا پھول نظر نہیں آیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا تو وہ شمّی کی کیاری میں نظر آ رہا تھا

"اچھا تو یہ ان کی حرکت ہے۔" جمّی نے کھرپی اٹھائی۔

اودے پھول والا پودا دوبارہ اس کی کیاری میں نظر آنے لگا۔

اتنے میں شمّی بھی آ گیا۔ اس نے سوچا، وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ لیکن کھرپی تو اس کے پاس بھی تھی۔ وہ اس پودے کی طرف بڑھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" جمّی بولا۔

"کیسی بدتمیزی؟" شمّی نے جواب دیا۔

'یہی کہ تم نے یہ پودا اپنی کیاری میں کیوں لگایا تھا؟"

"اس لئے کہ یہ پہلے میں نے دیکھا تھا اور اس پر پہلے میرا حق تھا۔"

"تم بکتے ہو۔ تم تو اس وقت پڑے خراٹے لے رہے تھے، جب

میں نے سب سے پہلے اسے دیکھا تھا۔"

"آپ جھوٹے ہیں۔"

"تم خود جھوٹے ہو۔"

"تم جھوٹے ہو۔"

"پھر تو کہنا۔"

"کیا کرلو گے؟" شمّی سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

"بتاؤں؟" جمّی نے اسے دھکا دیا۔ شمّی گر گیا، مگر وہ اٹھا اور اس نے اُٹھتے ہی ایک گھونسہ جمّی کے جڑ دیا۔

جمّی نے بھی گھونسہ مارا۔ دونوں آپس میں گھتم گھتا ہو گئے۔

انہیں یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ دونوں کی خوب صورت کیاریاں ان کی اس لڑائی سے برباد ہو گئی ہیں۔

پھر امی اور پاپا آ گئے اور ایک ایک چپت لگا کر دونوں کو الگ کیا گیا۔

"کیوں لڑے تھے تم دونوں؟" انہوں نے پوچھا۔

دونوں خاموش رہے۔

"بتاؤ؟" پاپا نے پھر سوال کیا۔

مگر وہ بتاتے کیا؟

کیسے بتاتے کہ اس اودے پھول کی خاطر وہ لڑے تھے جوان کے پیروں کے نیچے آکر خاک میں مل چکا تھا۔

دونوں خاموش کھڑے روتے رہے۔

●●

(کھلونا-دہلی)
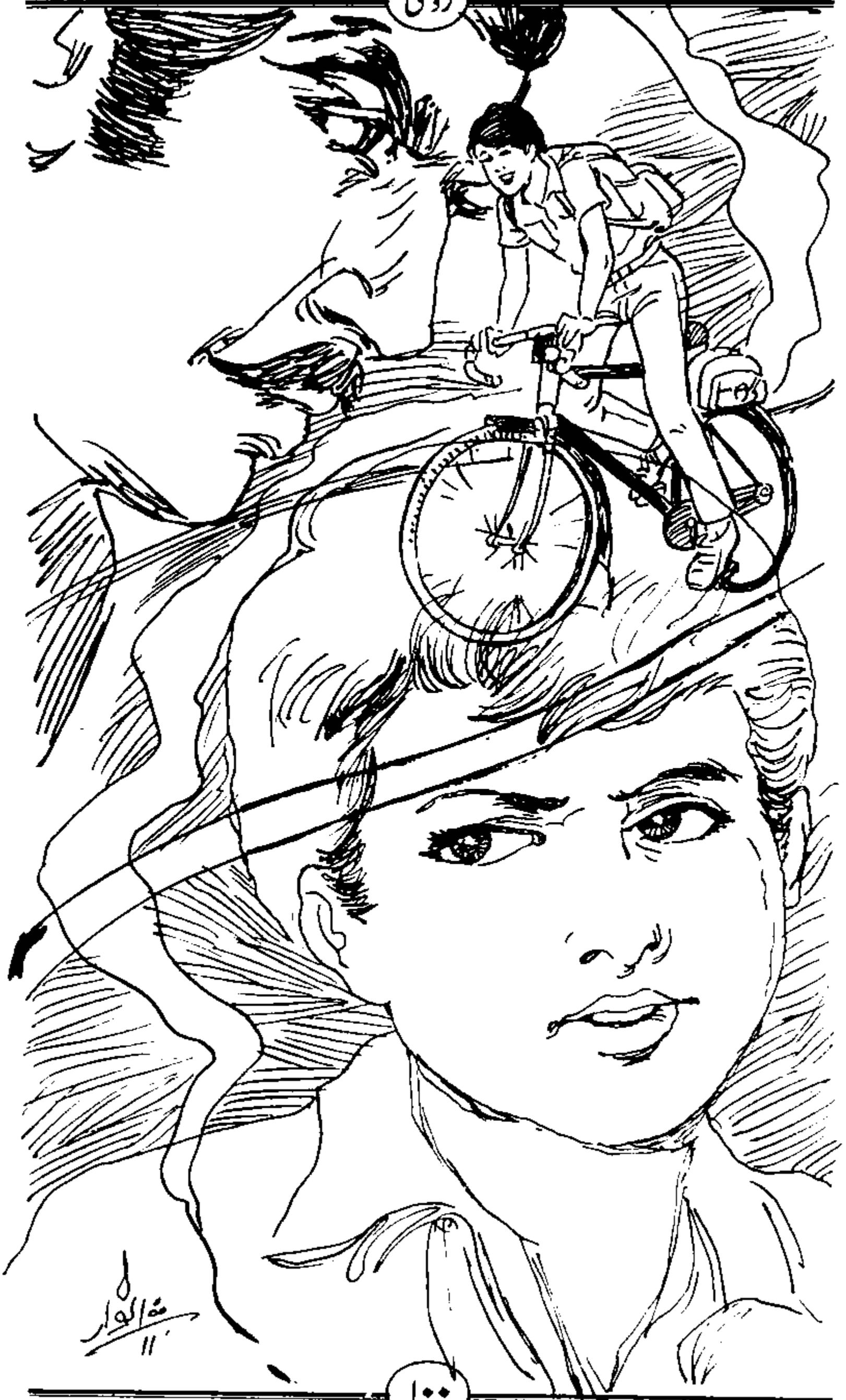
سزا

ان دنوں حیدر آباد کے افسر خان سائیکل چلانے کے لیے بے حد مشہور تھے۔ وہ ملک کے مختلف بڑے شہروں میں کئی کئی گھنٹے مسلسل سائیکل چلانے کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ جن کے بارے میں ہم اخبارات میں پڑھتے تھے۔ ان کے پروگرام کے اشتہارات بھی نظروں سے گزرتے رہتے تھے۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ وہ کبھی ہمارے شہر میں بھی آکر سائیکل چلائیں اور ہم بھی دوسرے شہروں کے خوش قسمت بچوں کی طرح افسر خاں کو اپنی آنکھوں سے سائیکل چلاتا دیکھ سکیں۔

کہتے ہیں خدا بچوں کی دُعائیں جلدی ہی سن لیتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک دن اخبار میں یہ خبر پڑھ کر...... کہ مشہور سائیکلسٹ افسر خاں ٹاؤن ہال کے میدان میں 120 گھنٹے مسلسل سائیکل چلا کر اپنا گذشتہ 100 گھنٹے کا ریکارڈ توڑیں گے" ہماری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا اور پھر اس روز جب ان کے پروگرام کا افتتاح ڈی۔ ایم صاحب نے کیا تو ہم اپنے دوستوں کے ساتھ سب سے آگے جا کر بیٹھ گئے۔ ٹاؤن ہال کا میدان دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ بہت بڑے پنڈال کے نیچے ایک دائرے میں افسر خاں نے سائیکل چلانا شروع کی۔ لوگوں نے ان کے گلے میں پھولوں اور نوٹوں کے ہار ڈالے، لاؤڈ اسپیکر سے ان کی گذشتہ کارگزاریاں بیان کی جانے لگیں اور ان کے اس پروگرام میں نئے کارناموں کا اعلان کیا گیا۔

یوں تو 120 گھنٹے مسلسل دن رات جاگ کر سائیکل چلانا ہی بہت بڑا کارنامہ تھا، اس کے ساتھ ہی ضروریات سے فارغ ہونا، شیو کرنا، نہانا اور کھانا وغیرہ روز سائیکل چلاتے ہوئے ہی کرنا تھا۔ اس وقت جب شیو کرنے یا نہانے کے لیے وہ سائیکل کے ہینڈل سے ہاتھ ہٹاتے اور سائیکل تیزی سے اپنے مدار میں گھومتی رہتی تو ہمارے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی اور محسوس ہوتا کہ دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہے۔ ہم دانتوں میں انگلی

حیرت کی تصویر بنے افسر خاں کو تیزی سے دوڑتی ہوئی سائیکل کی گدّی پر بیٹھے اور ہینڈل چھوڑے ہوئے یہ سب کرتے تکتے رہتے۔

افسر خاں اپنا 120 گھنٹے کا پروگرام مکمل کر کے کسی دوسرے شہر میں سائیکل چلانے چلے گئے اور ہمارے لیے ہمیشہ کی طرح پھر ایک خبر بن گئے۔ دو تین سال پر لگا کر اُڑ گئے۔ ہم نے جونیئر بورڈ کا امتحان پاس کیا تو طے پایا کہ اب انٹر کالج میں داخلہ لیا جائے گا تا کہ ہم ہائی اسکول تا انٹرمیڈیٹ وہاں تعلیم حاصل کر سکیں۔ کالج ہمارے گھر سے دور تھا۔ ہم ذرا خاموش ہوئے تو ابّو کو ہماری خاموشی محسوس ہوئی تب انھوں نے کالج آنے جانے کے لے سائیکل دلانے کا وعدہ کر لیا۔ ہمارے پڑوس کے دو تین لڑکے بھی سائیکل سے ہی کالج آتے جاتے تھے۔ سائیکل آئی تو ہمیں کالج کے میدان میں لے جا کر سائیکل چلانا سکھائی گئی۔ ایک دو بار گرنے کے بعد ہم سائیکل چلانا سیکھ گئے، کالج کھلا، ہمارا داخلہ ہو گیا تو ہم روز سائیکل سے کالج آنے جانے لگے۔ شروع شروع میں تو ذرا ڈر ڈر کر سائیکل چلانے کے تمام اصولوں کے ساتھ، آہستہ آہستہ سائیکل چلاتے رہے۔ پھر دوسرے لڑکوں کو دیکھ کر ہمت بڑھی اور ہم نے رفتار بڑھائی، پھر یہ ہونے لگا کہ کالج جاتے ہوئے یا کبھی کالج سے آتے ہوئے دوسرے لڑکوں

سے ''ریس'' میں آگے نکلنے کی کوشش ہونے لگی۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سائیکل چلانے میں کافی ماہر ہو گئے۔

ایسے ہی ایک دن اپنے سائیکل چلانے کے ماہرانہ کارنامے انجام دیتے ہم تیزی سے سائیکل دوڑاتے کالج سے واپس لوٹ رہے تھے کہ افسر خاں کا خیال آ گیا۔ خیال کیا آ گیا ان کے پروگرام کی پوری فلم آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی۔

''واہ کیا سائیکل چلاتے تھے'' ہم نے سوچا ہینڈل چھوڑ کر چلتی سائیکل پر تمام کام کر لیا کرتے تھے۔..........؟

دوسرے لمحے ہمارے ہاتھ بھی ہینڈل سے ہٹ گئے، مگر ذرا سا دل میں گرنے کا خیال آیا تو دوبارہ ہینڈل پکڑ لیا۔

مگر پھر ہمّت کی اور دوبارہ ہینڈل چھوڑ دیا۔

سائیکل پوری رفتار سے دوڑتی رہی اور یوں ہم پہلی بار مغل پورہ تھانے تک ہینڈل چھوڑ کر سائیکل چلاتے آئے۔ فیض گنج میں بازار ہے لہٰذا اس سڑک پر رفعت پورہ تک خاصی بھیڑ رہتی ہے وہاں ہینڈل چھوڑ کر سائیکل چلانا ممکن ہی نہیں تھا۔

دوسرے دن ہمارا ارادہ تھا کہ کالج تک ہینڈل چھوڑ کر سائیکل

چلائیں گے۔لہٰذا کالج کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر آتے ہی ہم نے ہینڈل چھوڑ دیا۔اس طرح سائیکل چلانے کے لیے رفتار معمول سے تیز رکھنی پڑتی ہے اسی لیے مغل پورہ تھانے تک آتے آتے دو جگہ ٹکرانے سے بچے، ایک بڑے میاں خود کو بچانے کے لئے گر ہی پڑے۔منگل کا دن تھا، بازار کی ہفتہ وار چھٹی تھی، فیض گنج سے رفعت پورہ تک برائے نام ہی بھیڑ تھی، ہم نے وہاں بھی ہینڈل نہیں پکڑا۔

تب ہی سامنے سے ابّو آتے دکھائی دیے۔انھوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا، پہلے تو وہ حیرانی سے ٹھٹک گئے، پھر شاید ہمیں روکنے کے لیے ہاتھ اٹھایا، مگر ہماری سائیکل کی رفتار تیز تھی۔انہیں حیران و پریشان کھڑا چھوڑ کر ہم آگے بڑھ گئے اور پھر ہم نے گھر کے سامنے ہی رُک کر دم لیا۔گھر میں آ کر سائیکل صحن میں اُگے امرود کے پیڑ کے تنے سے لگا کر کھڑی کر دی اور جلدی سے کالج یونی فارم اتار کر غسل خانے میں گھس گئے۔

غسل کر کے باہر نکلے ہی تھے کہ ابّو گھر میں داخل ہوئے......ان کے ساتھ شبّن مستری بھی تھے جن کی چوک میں سائیکل مرمت کی چھوٹی سی دکان ہے۔ان کے ہاتھ میں اوزاروں کا تھیلا بھی تھا۔ابّو نے صحن میں آتے ہی امرود کے تنے سے ٹکی کھڑی ہماری سائیکل کی طرف اشارہ کیا۔اشارہ

پا کر شبّن مستری اپنا اوزاروں کا تھیلا لے کر ہماری سائیکل کے پاس آ گئے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہماری سائیکل کا ہینڈل الگ کر دیا۔

''ارے یہ کیا کیا؟......ابّو دیکھئے......'' ہم نے بوکھلا کر کہا۔

''اب میاں آپ تو ہینڈل چھوڑ کر سائیکل چلا ہی لیتے ہیں۔'' ابّو شبّن مستری کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ہم نے سوچا سائیکل میں ہینڈل کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

●●

(اُمنگ - دہلی)

لطیفہ

دل چاہا کہ چلتی کار سے چھلانگ لگا دوں، یا پھر کار کی دیواروں سے سر ٹکرا دوں۔ لیکن کھڑکی کے باہر جھانکا تو سہم کر رہ گیا۔ کار بڑی تیزی سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ میں نے بے بسی سے ایک بار جاوید کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

جاوید نے ایک اور لطیفہ شروع کر دیا تھا۔

"ایک صاحب نے کسی وجہ سے خودکشی کا ارادہ کیا وہ اپنے ساتھ ناشتے دان میں کچھ کھانا لے کر ریل کی پٹری کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور ٹرین

کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد اُدھر سے ایک اور آدمی کا گزر ہوا۔ اس نے پوچھا ''کیاارادہ ہے؟۔''

''خودکشی کروں گا۔ ٹرین کا انتظار کر رہا ہوں۔'' اُنہوں نے جواب دیا۔

''اور یہ ناشتے دان؟۔''

''بھائی یہاں ٹرین اتنی لیٹ آتی ہے کہ کھانا ساتھ نہ ہوتو میں بھوکا ہی مر جاؤں۔''

سب کے ملے جلے قہقہے گونجے۔ اور مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ میں نے بُرا سا منھ بنا کر ایک بار جاوید کی طرف دیکھا وہ ایک اور لطیفہ سنانے کی تیاری کر رہا تھا۔

''ایک بار دو افیمی......''

میں نے اپنے کان بند کر لیے لیکن میرے کان بند کر لینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جاوید نے لطیفے سنانا بند کر دیے ہوں۔ وہ ایک کے بعد ایک لطیفہ سناتا جا رہا تھا۔ سب قہقہے لگا رہے تھے اور کار کی دیواریں ان قہقہوں سے گونج رہی تھیں۔

جاوید سے میری ملاقات شاہین بھائی کی سال گرہ پارٹی میں

ہوئی تھی ۔ وہاں میں انور ، راشد ، نفیس سب ہی موجود تھے ۔ یوں تو شاہین ہم سب کا کلاس فیلو تھا، لیکن ہم سب اُسے شاہین بھائی کہا کرتے تھے۔اس لیے نہیں کہ وہ ہم سب سے زیادہ عمر والا تھا، یا دولت مند باپ کا بیٹا تھا، یا ہم سے پڑھنے لکھنے میں تیز تھا۔بس نہ جانے کیا بات تھی کہ ہم سب اُسے شاہین بھائی کہا کرتے تھے اور وہ بھی ہم سب دوستوں کو اپنا بھائی ہی سمجھتا تھا۔

ہم سب ''چھوٹوں'' کے علاوہ وہاں اُس روز بہت سے بڑے مہمان بھی موجود تھے، لیکن ہم چھوٹوں کو اس روز بڑی آزادی ملی ہوئی تھی۔ ''سب بڑے'' جتنے بڑے بڑے تحفے لائے تھے، اتنی ہی بڑی بڑی باتیں کر رہے تھے مثلاً چچا عاقل امریکہ سے کم کی بات ہی نہیں کر رہے تھے۔ان کے نزدیک امریکہ سے زیادہ تہذیب یافتہ کوئی ملک ہی نہیں تھا۔ایک اور بڑے تھے جن کے لباس سے لے کر جوتے میں پڑے ہوئے تسمے تک 'فارن' سے منگائے گئے تھے۔ایک اور صاحب تھے جو میر کے شعر اپنے بتا کر سنا رہے تھے۔ایک اور صاحب تھے، جو چہرے سے تو بالکل اُن پڑھ معلوم ہوتے تھے لیکن باتیں کورٹ کی کر رہے تھے خدا جانے وکیل تھے یا کسی منصف کے چپراسی ۔غرض بڑی رنگا رنگ پارٹی تھی۔

ایک طرف چھوٹوں نے بھی ملی ہوئی آزادی سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی محفل جما رکھی تھی۔ان ہی چھوٹوں میں جاوید تھا وہ لطیفے سنا رہا تھا۔ایک کے بعد ایک۔میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔شاہین بھائی مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے اُدھر آ گئے اور مجھے جاوید سے ملوایا۔

اُس روز میں جاوید سے مل کر بے حد خوش ہوا۔

ہم سب ساتھیوں میں ایک سے ایک شریر تھا ایک سے ایک باتونی اور ایک سے ایک تیز تھا۔لیکن کسی بھی ساتھی کو اتنے دل چسپ لطیفے یاد نہیں تھے۔اکثر ہم کھلونا یا دوسرے رسالوں میں سے لطیفے پڑھ کر یاد کر لیتے اور ایک دوسرے کو سنایا کرتے۔لیکن جب سب ہی ایک زبان ہو کر کہہ دیا کرتے کہ یہ تو پرانا ہے تو بڑی کوفت ہوا کرتی۔لیکن اس روز جاوید نے جتنے بھی لطیفے سنائے وہ بے حد دل چسپ تھے اور ہم سب کے لیے بالکل نئے۔

اس روز کے بعد جاوید ہم لوگوں کا گہرا دوست بن گیا، وہ ایک اور اسکول میں تھا۔اس لیے ہم سب شام کو یا تو اس کی طرف چلے جاتے یا پھر وہ ہماری طرف آ جاتا اور پھر ہم گھنٹوں اس کے لطیفے سُن سُن کر قہقہے لگاتے رہتے۔

لیکن ایک روز ایک حادثہ ہو گیا۔ نفیس نے مجھے ٹیلی فون کیا۔ میں اسی وقت پاپا کے ساتھ نمائش دیکھ کر لوٹا تھا۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی گھنٹی بجی تھی۔ پاپا نے رسیور اٹھایا اور پھر میری طرف بڑھا دیا۔

''کیا بات ہے نفیس؟ اس وقت کیوں ٹیلی فون کیا''

''اشتیاق کو دورہ پڑا ہے اور وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔'' دوسری طرف سے نفیس نے بتایا۔

''ارے!۔''

''میں ادھر جا رہا ہوں۔ تم شاہین بھائی کو لے کر آ جاؤ۔''

''اچھا، وارڈ نمبر تو بتا دو۔''

نفیس نے نمبر بتایا اور فون رکھ دیا۔

اشتیاق ہم لوگوں کا بہت عزیز دوست تھا۔ میں نے پاپا کو بتایا تو انہوں نے مجھے اسپتال جانے کی اجازت دے دی۔ سائیکل لے کر میں شاہین بھائی کی طرف آیا۔ وہاں جاوید، انور اور راشد موجود تھے سب ساتھ چل پڑے۔ جاوید نے راستے میں دو ایک لطیفے سنائے تو چند لمحوں کے لیے اشتیاق کے لیے جو فکر دل پر چھائی ہوئی تھی کم ہو گئی لیکن اسپتال پہنچ کر اور اشتیاق کی حالت دیکھ کر فکر اور بھی بڑھ گئی۔

واپسی پر جاوید نے پھر دو ایک لطیفے سنائے۔ لیکن میں نے دھیان تک نہیں دیا کہ اس نے کیا سنایا۔ غالباً کسی نے بھی دھیان نہیں دیا تھا، اور جاوید ہی اپنے سنائے ہوئے لطیفے پر اکیلا ہنسا تھا۔

دو تین دن تک ہم سب اکٹھے نہیں ہو سکے۔ کبھی میں اسپتال ہوتا، کبھی شاہین اور نفیس، کبھی انور اور راشد ہم سب بے حد پریشان اور فکر مند تھے۔ ایک روز جب رات کو میں اور شاہین بھائی اسپتال سے نفیس اور انور کو وہاں چھوڑ کر گھر آئے تو ہم دونوں تین راتوں کے جاگے ہوئے تھے۔ آتے ہی نیند آ گئی۔ شاہین بھائی بھی ہمارے ہی یہاں سو گئے۔

صبح کو جب ہم اسپتال جانے کی تیاری کر رہے تھے تو نفیس کا ٹیلی فون آیا۔

''اشرف، اشتیاق،، اس کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ بتاؤ تو۔'' میں گھبرا گیا۔

''اشتیاق نہیں رہا......'' دوسری طرف سے شاید نفیس کے رونے کی آواز آئی تھی۔

میرے ہاتھ سے رسیور چھوٹ کر گر گیا، اور شاہین بھائی سمجھ گئے کہ وہ حادثہ ہو گیا جس کی اُمید نہیں تھی۔ میں سکتہ کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔

''اشتیاق۔اس......''میں آگے کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔شاہین بھائی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔''جاوید کو خبر کردو۔میں نے ہمت کر کے نمبر ڈائل کیے۔شاہین بھائی دیوار سے لگے لگے رو پڑے۔

''کون بھئی اشرف؟یار تم لوگ ایسے غائب ہو کہ پتہ ہی نہیں۔''

جاوید دوسری طرف میری بات سنے بغیر بولتا گیا''میں نے دس بارہ لطیفے تم لوگوں کو سنانے کے لیۓ اکٹھا کیۓ ہیں۔''

''میری بات تو سنو۔''میں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوۓ کہا:

''کیا خاک بات سنوں!''تم تو جانتے ہو کہ لطیفے نہ سناؤں تو میرے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔

''جاوید میری بات تو سن لو۔وہ اشتیاق۔''

''اماں گولی مارو اشتیاق کو تم ایک لطیفہ سنو۔''

''جاوید!''مجھے غصہ آ گیا......''اشتیاق کا انتقال ہو گیا۔''

''ارے مرنا،جینا تو لگا ہی رہتا ہے......ہاں تو ایک صاحب......''

میں نے جھلا کر ریسور کریڈل پر پٹخ دیا۔

آج کئی ماہ بیت گئے اس حادثے کو،لیکن میں نے کسی سے بھی اس

بات کا ذکر نہیں کیا کہ جاوید سے مجھے اس روز سے نفرت ہے۔ مجھے اس کے یہ لطیفے زہر معلوم ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب ہی اشتیاق کو بھولتے جارہے ہیں لیکن جب جاوید کوئی لطیفہ سناتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اشتیاق کی لاش کے سرہانے کھڑا قہقہہ لگا رہا ہو۔

آج سب نے طے کیا کہ یہ سال گزر رہا ہے نیا سال شروع ہونے والا ہے، کیوں نہ سال کے آخر کے ان دنوں میں کوئی پکنک منالیں۔ ہم سب گوٹ جھیل پر پکنک منانے جارہے ہیں۔ جاوید لطیفے سنا رہا ہے۔ کار تیزی سے تارکول کی سیاہ سڑک پر دوڑی چلی جارہی ہے سب قہقہے لگا رہے ہیں کار کے در و دیوار ان قہقہوں سے گونج رہے ہیں۔ جاوید نے ایک نیا لطیفہ شروع کیا۔

''ڈرائیور نے مڑکر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہم سب لوگ چیخ پڑے۔ ڈرائیور نے بڑی پھرتی سے کار بچائی مگر وہ بڑھیا جھپٹ میں آ گئی اور سڑک پر کافی دور تک لڑھکتی چلی گئی۔

کار رُک گئی۔ ہم سب نے پکنک پر جانے کا پروگرام ختم کردیا۔ بڑھیا بے ہوش تھی اسے اٹھا کر اسپتال لائے۔ اس کے سر میں بڑا گہرا زخم تھا اور خون جاری تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بڑھیا کو خون دیا جائے گا اور اس

چھوٹے سے اسپتال میں خون موجود نہیں اور وقت بہت کم تھا۔

ہم سب خاموش تھے۔ ''کون دے گا خون؟''

ڈاکٹر صاحب میرا خون ٹیسٹ کر لیجئے۔'' جاوید آگے بڑھا۔

ڈاکٹر نے خون ٹیسٹ کیا، اور خوش خبری سنائی کہ اس کا خون بڑھیا کے خون سے ملتا ہے۔

جاوید ٹیبل پر لیٹا ہے اور بوند بوند کر کے اس کا خون بوتل میں ٹپک رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کرب کی پرچھائیاں ہیں۔ ہم سب اس کے قریب کھڑے ہیں۔

''ایک لطیفہ یاد آ گیا'' وہ زبردستی مسکراتا ہے۔ ''ایک آدمی ایک نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہنے لگا ڈاکٹر میں کوشش کے باوجود خوش نہیں رہتا۔ ڈاکٹر نے اسے رائے دی کہ وہ اس شہر میں رہنے والے ایک مسخرے کے پاس جائے جو دوسروں کو خوش کرتا ہے وہ آدمی ہنسا اور بولا وہ مسخرہ تو میں ہی ہوں۔''

ہم سب ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کسی کو بھی ہنسی نہیں آتی۔

صرف جاوید کی پھیکی سی ہنسی سنائی دیتی ہے۔ ●● (کھلونا - نئی دہلی)

اپنا کام

بھابھی نے جس روز سے گھر میں قدم رکھا، بس گھر کی کایا ہی پلٹ گئی (کایا پلٹ ہونے سے میری مراد یہ نہیں کہ انھوں نے آتے ہی گھر کو اپنے جادو کے ڈنڈے سے محل بنا دیا ہو اور دودھ کی نہریں نکال دی ہوں) ویسے بھائی جان کا خیال یہی تھا کہ حُسنیٰ بھابھی ضرور کوئی جادوگر ہیں اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اتنا ضرور ہوا تھا کہ انھوں نے گھر کے تین شیطانوں، تین کام چوروں کو ضرور رام کرلیا تھا۔ وہ تین کام چور تھے: پاشو، جاوی اور شمو۔ پاشو صاحب کیوں کہ آٹھویں، جماعت کے طالب علم ہیں اور اتفاق

سے اسکول میں اپنی کلاس کے مانیٹر بھی، اس لئے وہ گھر بھر میں کسی کی بات ہی نہیں سُنتے۔ بھائی جان کبھی کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر کام کرا ہی لیا کرتے، مگر باجی کو وہ چٹکیوں میں اُڑاتے۔ اور امّی...... اوّل تو امّی کو کبھی کوئی کام ہی نہ ہوتا، اور اگر ہوتا بھی تو وہ سب سے پہلے بھائی جان سے کہتیں۔ بات باجی پر آکر رُک جاتی وہاں سے پاشو تک پہنچتی۔ پاشو بھی اس سلسلے کو جاری رکھتے اور کام کو جاوی پر ٹال دیتے۔ اور جاوی بے چاری شمو پر حکم چلانے لگتے۔

جاوی اور شمّو بھی بہرحال اسی گھر میں رہتے تھے۔ ان پر بھی کچھ نہ کچھ رنگ تو آتا ہی۔ لہٰذا جب کسی کام کی ذمہ داری ان پر آن پڑتی تو وہ اس کو ٹالنے کے لئے کوئی اور راستہ تلاش کر ہی لیا کرتے تھے۔

شاید اسی لئے گھر بھر میں یہ تینوں شیطان اور کام چور کے نام سے مشہور تھے۔

لیکن جیسے ہی بھابھی نے گھر میں قدم رکھا تو بقول بھائی جان کے نہ جانے انھوں نے کیا پڑھ کر پھونک دیا کہ وہ تینوں ہر کام بڑی مستعدی سے کرنے لگے اور پھر یہ ہوا کہ ان تینوں کے سابقہ خطابات واپس لے لئے گئے، بلکہ ہر روز نئے نئے اور معزز قسم کے خطابات سے نوازا جانے لگا۔

''بھئی پاشو تم تو بہت ہی اچھے لڑکے ہو! آج تک تمہارا جیسا محنتی اور پڑھنے والا لڑکا میں نے نہیں دیکھا۔ یو آر اے مون'' بھابھی اس کی کمر ٹھونک کر کہتیں اور چاند کا خطاب ملنے پر پاشو صاحب کا پتہ پھول جاتا۔

''جاوی بھیا، ہماری چیز لائے؟ ارے شاباش...... خدا جانتا ہے میں تم سے کتنی خوش ہوں۔ تم تو بہت ہی محنتی لڑکے ہو۔ یو آر ویری ویری گڈ بوائے۔'' بھابھی نے جاوی صاحب کو بھی ''بہت بہت اچھے لڑکے'' کے خطاب سے نواز دیا اور کچھ اسی طرح شمّو کو بھی خوش ہو کر انھوں نے ''ہنی ڈال'' یعنی شہد کی گڑیا کا خطاب بخش دیا تھا۔

خطابات کی اس بارش کا نتیجہ ظاہر تھا۔ بس ذرا بھابھی کے ہونٹ ہلے کہ یہ تینوں اپنے آپ کو حاضر کر دیتے۔

بھائی جان کہتے، ''بھئی حُسنیٰ! تم نے تو کمال کر دیا، بھلا یہ پاشو میاں ایسے تھے کہ کسی کی بات کو کان تک آنے دیتے۔ یقین کرو! دور ہی سے سمجھ لیتے کہ میں کوئی کام بتانے والا ہوں، مگر بھئی مان گیا ہوں تمہارے جادو کو، جادی اور شمّو جیسے چوروں کو اپنا غلام بنالیا ہے۔''

''دراصل آپ بچّوں کی نفسیات......'' بھابھی بالکل بزرگوں کے انداز میں بولنا شروع کرتیں، لیکن بات پوری ہونے سے پہلے ہی بھائی

جان کا قہقہہ گونج اُٹھتا۔

''بس! خدا کے واسطے بچّوں کی نفسیات کے بارے میں کچھ نہ کہنا، تمہیں وہ لطیفہ یاد نہیں رہا، کہ ایک صاحب کی کسی بچّے سے ملاقات ہوگئی، بچّہ پیاسا تھا اور ''پانی، پانی'' کہہ کر رو رہا تھا۔ ان حضرت نے پانی پلا دیا، مگر بچّہ خاموش نہ ہوا اور کہنے لگا'' آپ نے مجھے پانی کیوں پلایا، اب میرے پیٹ میں سے پانی نکال لیئے۔''بس وہ حضرت ہاتھ جھاڑ کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے.....تو حُسنا ذرا ہوشیار ہی رہنا.....''

بھابھی ہنسنے لگیں۔ بھائی جان نے کہا،''خیر تم اپنے تجربے کرتی ہو، لیکن ذرا ہوشیار رہنا کہیں یہ یوں ہی سیدھے بن کر تمہیں مات نہ دے ڈالیں۔''

ایک دن بیٹھے بٹھائے بھابھی کو کیا سوجھی کہ انھوں نے تینوں کو اپنے کمرے میں اکٹھا کیا اور ''اپنا کام خود کرو'' پر لیکچر دینے لگیں۔ ''تم تینوں بہت اچھے بچّے ہو، ہر کام خوب دل لگا کر اور محنت سے کرتے ہو، ٹھیک ہے آدمی کو کام کرنا چاہئے، محنت کرنی چاہئے، دُنیا میں جتنے بھی بڑے آدمی ہوئے ہیں، سب کے پیچھے ایک ہی تاریخ ہے، کام اور محنت ، امریکہ کے سابق صدر ابراہیم لنکن کا نام تم نے ضرور سُنا ہوگا، وہ ایک

غریب آدمی تھے...... بہت ہی غریب۔''

جی ہاں بھابھی، اور وہ محنت اور لگن سے امریکہ کے صدر بن گئے۔''

وہ تینوں ایک آواز ہو کر بولے۔

''بالکل ٹھیک ہے لیکن، سب سے بڑی ضرورت ہے آدمی کو اپنا کام خود کرنے کی۔ تم نے اکثر کھلونا میں پڑھا ہوگا کہ امریکہ میں لوگ اپنے گھر کے بہت سے کام خود ہی کر لیتے ہیں، مستریوں اور مزدوروں سے نہیں کراتے۔ وہاں مستری اور مزدور کام کی اُجرت بہت زیادہ لیتے ہیں۔ اس لئے وہاں رہنے والے اپنا چھوٹا بڑا کام خود کرتے ہیں، اسی سے وہ ترقی بھی کرتے ہیں اور دولت مند بھی ہیں۔'' بھابھی نے رُک کر تینوں کے چہروں پر نگاہیں دوڑائیں، وہ تینوں بڑی دل چسپی سے اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔

''دیکھو...... باغ کی چہار دیواری پر کافی دِن سے سفیدی نہیں ہوئی ہے، یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ یہ نوکر چاکر یا مزدور محض وقت گنواتے ہیں۔ ان کو کام سے کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا، اور پیسے الگ خرچ ہوتے ہیں۔ کل اتوار کا دن ہے، تم سب کی چھٹی ہوگی، بس اس دیوار پر سفیدی کر ڈالو۔ تمہارا چھٹی کا دن بھی گزر جائے گا اور باغ کی رونق بھی بڑھ جائے گی۔ اور

جب تم شام کو باغ میں گھومو گے تو عجیب سی خوشی محسوس کرو گے۔ کیوں کہ یہ رونق تم سب کی محنت سے آئے گی۔ کہو...... تم لوگ تیار ہو......؟

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے اور پھر تینوں ایک آواز ہو کر بولے۔ ''واہ بھابھی یہ بھی کوئی کام ہے، صرف چہار دیواری...... اگر آپ کہیں تو پوری کوٹھی پر سفیدی کر دیں، مگر...... خیر ہم اتنے بڑے کہاں؟''

بھابھی نے مُسکرا کر تینوں کی کمر ٹھونکی، ''اچھا، تو صبح کو تم لوگ تیار رہنا۔''

تینوں اس رات کافی دیر تک سوچتے رہے۔

''یہ بھی کوئی بات ہوئی، اب یہ سفیدی کیسے ہو گی، میں تو نہیں کروں گا۔'' پاشو نے سوچا میں تو آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہوں کیا اب دیوار پر سفیدی کروں گا؟ خیر دیکھا جائے گا، طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے اُٹھوں گا ہی نہیں۔''

کچھ ایسا ہی خیال جادی اور شمّو کے دل میں بھی آیا، صبح کو تینوں ایک ساتھ اُٹھ بیٹھے اور اب جب اُٹھ ہی بیٹھے تو پھر کسی بہانے کا کیا ذکر۔ اور پھر بھابھی نے بھی نہ جانے کب سے سفیدی تیار کر رکھی تھی کہ

ان تینوں کو کونچیاں اور سفیدی کی بالٹیاں دیوار کے پاس سفیدی سے بھری رکھی ملیں۔

تینوں نے، مرے ہوئے دل سے سفیدی شروع کر دی۔

''اوہ باپ رے'' جادی چلاّیا ''میرے ہاتھ میں کل پنسل تراشتے وقت بلیڈ لگ گیا تھا، پاشو بھیّا مجھ سے تو سفیدی نہیں ہوتی۔ ہاتھ میں مرچیں سی لگتی ہیں۔''

''تو میں کیا کروں...... بھابھی سے کہو......'' پاشو نے منہ بنالیا۔

جادی صاحب کونچی چھوڑ یہ جاوہ جا۔ اور پھر لوٹ کر ہی نہ آئے۔

پاشو اور شمّو سفیدی کرتے رہے۔

اچانک شمّو کی آنکھ میں کوئی چھینٹ جا پڑی۔

''ہائے مری...... پاشو بھیّا......'' کہہ کر وہ آنکھ دبا کر بیٹھ گئی۔ پاشو نے بھابھی کو آواز دی۔ بھابھی شمّو کو لے کر چلی گئیں اور چلتے وقت کہہ گئیں ''بس تھوڑی ہی رہ گئی ہے...... تم اکیلے ہی ختم کر لو گے، تم ان دونوں سے ہوشیار بھی ہو...... شاباش...... شاباش......''

بھابھی اندر چلی گئیں اور وہ ہاتھ میں کونچی پکڑے ہوئے، بھابھی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ اتنی لمبی دیوار اور وہ اکیلا! پاشو اُداس ہو گیا،

مگر وہ بھابھی کی نظروں میں اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنا چاہتا تھا کہ بھابھی اس کو کام چور کہہ دیں، اس لئے وہ سفیدی کرنے لگا۔

اتنے میں گارڈ صاحب کا لڑکا شاہد ٹرین چلنے کی آواز کی نقل کرتا ہوا آیا۔ پاشو نے اُسے دیکھ لیا، لیکن اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور سفیدی کرتا رہا۔

''اوہو......تو آج جناب کام میں لگے ہوئے ہیں۔'' شاہد نے دیوار کی طرف دیکھ کر کہا۔ مگر پاشو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور کسی آرٹسٹ کی طرح دیوار پر نظر ڈالی، کونچی چلائی اور پھر پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔

''کہو......آج بھی کام کرنا پڑ رہا ہے۔'' شاہد نے اس کے کان کے قریب منھ لے جا کر کہا۔ پاشو چونک پڑا۔

''ارے......شاہد......تم کب آئے؟ میں نے خیال نہیں کیا......''

''میں تو تالاب میں تیرنے جا رہا ہوں......کیا تمھارا دل نہیں چاہ رہا!''

''نا بابا......میں تو کام میں لگا ہوں۔ اتنا اچھا کام کسی کو روز روز کرنے کو ملتا ہے کہیں؟''

''یہ کام ہے......تم اسے کام کہتے ہو......'' شاہد نے بُرا سا منھ بنایا۔

''ہاں ہوسکتا ہے یہ کام نہ ہو......مگر میں تو یہ جانتا ہوں کہ مجھے اس کام میں بڑی عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا ہے۔''

شاہد نے عجیب سی نظروں سے پاشو کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ پاشو نے کوچی دیوار پر چلائی اور پیچھے ہٹ کر دیکھا۔ پھر کوچی چلانے لگا۔ شاہد کھڑا کھڑا دیکھتا رہا، اس کی دل چسپی پاشو کے کام میں بڑھتی جا رہی تھی، آخر وہ بولا ''یار پاشو!......ذرا میں بھی سفیدی کر کے دیکھوں۔''

پہلے تو پاشو نے کچھ سوچ کر کوچی شاہد کی طرف بڑھا دی، مگر پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ ''نہیں یار، تم سے یہ کام نہیں ہوگا، بھابھی کا کہنا ہے، اپنا کام خود کرنا چاہیے......اور پھر اسی چہار دیواری سے باغ کی رونق بڑھے گی۔ اور بھابھی یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ ہزار دو ہزار لڑکوں میں شاید ہی کوئی ایک ایسا نکلے جو ٹھیک سے سفیدی کر سکے۔''

''اچھا یہ بات ہے! پاشو مجھے ذرا سفیدی کر لینے دو پھر دیکھنا کہ ان لڑکوں میں میرا نام بھی ہوگا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر بھابھی؟ دیکھو نہ جاوی بھی سفیدی کرنا چاہتا تھا مگر بھابھی نے صاف منع کر دیا، شمّو بھی چاہتی تھی مگر بھابھی نے اس کو بھی اجازت نہیں دی، اب تم سوچو کوئی خاص بات ہی تو ہوگی کہ مجھے

سفیدی کرنی پڑ رہی ہے......''

''میں بہت ہوشیاری سے سفیدی کروں گا، پاشو بس تم ذرا......''
شاہد خوشامد کرتا ہوا بولا اور اس نے پاشو کے ہاتھ میں سے زبردستی کوچی لے لی۔ بڑے ہی بجھے ہوئے انداز میں پاشو نے کوچی چھوڑ دی اور آرام کرنے کے لئے آم کے درخت کے سائے میں ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا'' کاش! کچھ اور ایسے ہی دوست مل جائیں......''

سورج آہستہ آہستہ ڈھلتا جارہا تھا، شاہد نے آخری بار کوچی چلا کر روک دی اور بھاگ کر پاشو کے پاس آ گیا۔ وہ بُری طرح تھک گیا تھا۔

''کہو دوست......ذرا اُٹھ کر دیکھو، کیا میں اُن لڑکوں میں سے نہیں ہوں، ؟ میرا خیال ہے بھابھی تمہاری طرح مجھے بھی ان لڑکوں میں گننے لگیں گی۔ اُفوہ......میں تو تھک گیا......'' اور شاہد اسی بینچ پر تھک کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

'' کہئے اب کیا خیال ہے......'' بھائی جان بھابھی سے بولے۔ دونوں کافی دیر سے اسی آم کے درخت کے پیچھے کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

''میں ابھی اس کی خبر لیتی ہوں......'' بھابھی جھلّائی ہوئی آئیں۔

مگر پاشو وہاں تھا ہی نہیں، وہ تو بھائی جان کی آواز سنتے ہی کھسک گیا تھا۔ اور دن بھر کا تھکا شاہد بینچ پر لیٹا آہستہ آہستہ خراٹے لے رہا تھا۔

"اُف...... اللہ رے کام چور......" بھابھی پاؤں پٹکتی ہوئی اندر کی طرف چل دیں۔

اور بھائی صاحب کا قہقہہ سنائی دیا "یاد ہے نا وہ لطیفہ ایک صاحب اپنے آپ کو......" مگر بھابھی اندر جا چکی تھیں۔

اس کے بعد کیا ہوا؟

بس یہ ہوا کہ بھابھی نے اپنے تمام خطاب واپس لے کر پھر سے تینوں کو کام چور کہنا شروع کر دیا۔"

(مرکزی خیال انگریزی سے)

●●

(کھلونا۔ نئی دہلی)